پھول کا نام

(افسانے)

حسن ساہو

طابع .... چاند پریس جموں

ناشر .... حاجی محمد ابراہیم

خوش نویس .... گوپی ناتھ کاشمیری

قیمت .... دس روپے

تعداد .... ایک ہزار

ملنے کا پتہ

• رفتار۔ راج تلک روڈ۔ جموں۔ توی

•• حاجی کلو اینڈ سنز۔ واچ میکرز۔ امیراکدل۔ سرینگر (کشمیر)

ترتیب

اپنے جگری دوست جگدیش موہن

کے

نام

خلوص اور محبت کے ساتھ جن

کے بھرپور پیار سے پھول کا قائم

معرضِ وجود میں آیا۔

کھلونا

"پاگل" پاگل ..... حسن کے کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔ وہ برابر بھاگتا چلا گیا۔ بچے ہاتھوں میں پتھر لئے اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔ جہاں کہیں بھی اُس کے قدم رُک گئے۔ اور تھکاوٹ دُور کرنے کے لئے اُس نے بیٹھنا چاہا۔ تو پتھروں اور کنکروں کی بارش ہو جاتی —— اب وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ جتنا بھاگ سکتا تھا بھاگا۔ اور شہر کے شور و غل سے دُور جا کر اُس کا سانس پھولنے لگا۔ ٹانگیں چلنے سے جواب دے گئیں۔ جیسے اُن میں آگے بڑھنے کی سکت ہی نہ تھی۔ حسن اپنا سا مُنہ درست اور تھکاوٹ دُور کرنے کی خاطر سامنے والے چنار کے درخت کے نیچے لیٹ گیا .... گھنی چھاؤں میں .... جہاں اُس نے اپنے چاروں طرف یہ دیکھنے کے لئے نظر دوڑائی کہ یہاں کوئی اُسے ستانے والا تو نہیں ...

آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ سوچنے لگا اور سامنے والی قبر کو گھورنے لگا۔ جس پہ چنبیلی کا نازک پودا جھوم رہا تھا۔ یکایک اُس کے منہ سے نکل گیا:۔

"آہ طلعت تم امینہ اور شریفہ کی طرح کہاں چلی گئیں۔ مجھے تنہا چھوڑ کے کہاں کھو گئیں۔ دیکھو تمہاری جُدائی کے بعد تمہارے بھیا کا کیا حال ہو گیا ہے۔ طلعت سُنو لوگ مجھے پاگل تصوّر کرتے ہیں۔ بچے مجھ پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ پاگل سمجھ کے ــــ اُف تیری جُدائی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا میری زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ اب تو گُل ہونے کو ہے۔

طلعت! تمہارے چلے جانے سے میرے خون سے سینچے گئے چمن میں پھر خزاں کا دور دورہ ہوا ہے۔ تمہاری موت نے میری تمناؤں اور اُمنگوں کا گلا گھونٹ کر زمین دوز تہہ خانوں میں بند کر دیا۔ میری خوشی کے سارے دروازے بند پڑے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میں اب ایک زندہ لاش کی حیثیت رکھتا ہوں۔ زندہ لاش۔

طلعت! کہاں ہو! آؤ اپنے بھیّا کے گلے لگ جاؤ! یہاں تو اور کوئی نہیں۔ میں ہوں اور وسیع قبرستان.... آؤ بہن اور میری بربادی کا نظارہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ طلعت...." ــــ اتنا کچھ سوچنے کے بعد حسن کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ اُس کی بوجھل آنکھوں کے سامنے ماضی کے دُھندلے نقوش اُبھرنے لگے۔

گذرے واقعات ایک ایک کر کے اُس کے ناکارہ دماغ میں رینگنے لگے۔ اور وہ پُرانی یادوں میں کھو کر رہ گیا:۔

وہ بھی ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ جب وہ چھ برس کا تھا تو اپنے ہم عمر لڑکوں کو اپنی بہنوں کے ساتھ گڑیا کھیلتے ہوئے دیکھتا تو اُسے بھی اس بات کی خواہش ہوتی کہ "کاش اُس کی بھی کوئی بہن ہوتی اور وہ بھی اُس کے ساتھ گڑیا کھیلتا" ____ حسن کے دل میں آرزو جاگ اُٹھی .... تمنا اُبھری اور آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اُٹھا کر معصومانہ انداز میں دعا مانگی ____ "یا اللہ! میری پریشانیوں کو دُور کرنے کیلئے مجھے ایک ننھی منھی بہن عطا کر۔"

خدا نے اُس کی دعا قبول کرلی۔ اُس کو لاڈلی بہن مل گئیں اور جس کا نام طلعت فاطمہ رکھا گیا۔ حسن اپنی بہن کو پیار سے طلعت ہی کہتا تھا۔ اس کے بعد اور دو بہنیں بھی حسن کی نگری میں داخل ہوگئیں۔ لیکن کلی سے شگفتہ بنتے ہی امینہ اور شریفہ نے ساتھ چھوڑ دیا .... اب صرف طلعت تھی ____ طلعت اُسے کس قدر چاہتی تھی۔ اُف کس قدر محبت تھی۔ ان بہن بھائیوں میں .... بے لوث پیار .... طلعت کے دل میں اپنے بھیا کے لیے کتنی عزت اور ہمدردی تھی۔

ایک دن جبکہ حسن کا چہرہ بخار کی وجہ سے جل رہا تھا اور یکایک رات میں تیز بخار کے باعث سرزمد نے بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ... اس وقت وہ بے ہوش بستر پر پڑا تھا اور وہ اس بات سے بے خبر تھا۔ کہ ساری رات اُس کی لاڈلی بہن اس کے سرہانے بیٹھ کر نمک کے پانی کی پٹیوں پر پٹیاں بدلتی رہی۔ وہ کئی بار اپنے بھیا کو دوا بھی پلاتی رہی اور ایک لمحہ بھی اُس کی آنکھ نہ لگی۔

ــــ پھر جب صبح حسن کی آنکھ کھلی تو اس نے پینے کے لئے پانی مانگا لیکن جب پاس نظر پڑی تو دیکھا اپنی چھوٹی بہن کرسی کے پاس ہی سوئی پڑی تھی۔ اور کمرے کی لائٹ برابر جل رہی تھی ــــــــ اُس نے خیال کیا کہ طلعت اُس کی خاطر ساری رات جاگتی رہی ..... اور وہ اُس سے ناراض ہو گیا تھا۔ کہ کیوں وہ ساری رات جاگتی رہی ــــ اور اس قصور کے جواب میں نہایت ہی بھولے پن میں طلعت نے کہا تھا ــــ "نہیں بھیّا! میں بالکل نہیں جاگی! آپ کو کیسے معلوم ہوا جبکہ آپ ساری رات بے ہوش رہے"!

اور حسن اس جواب پر ہنس پڑا۔ ساتھ ہی کہنے لگا۔

"مجھے بدھو بنانا چاہتی ہو۔ اچھا تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ساری رات ہوش میں نہ تھا۔ جبکہ تم سوئی ہوئی تھی"۔ ــــــــ

اس جواب سے طلعت سٹ پٹا گئی۔ وہ جواب میں کچھ کہہ نہ سکی۔ اور دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے گلے لگ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ کتنا درد اور اُنس تھا۔ ایک دوسرے کے لئے ان معصوم دلوں میں ــــــــ حالانکہ طلعت حسن سے چند برس چھوٹی ہی تھی پھر بھی وہ اُسے "بڑی باجی" خیال کر کے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور طلعت بھی تو کبھی کبھی "بڑی باجی" کا لباس زیب تن کئے ! احسن کو ڈانتی تھی ــــــــ

ــــــــ حسن نے دوبارہ اپنے چاروں طرف نظر گھمائی۔ وہاں کوئی نہ تھا جو اُسے تنگ کرتا ــــ اور پھر اُس کا دماغ ماضی کے

اتھاہ گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ پھر فکر و تخیل کا پنچھی اس کی دماغی وسعتوں میں پرواز کرنے لگا۔

"طلعت تو اس کے بغیر کھانا بھی نہ کھاتی تھی اور کبھی اگر مدرسے سے جانے کو دیر ہو جاتی تھی تو طلعت روٹھ جاتی تھی۔ اور پھر اپنی بہن کو منانے کے لئے حسن مٹھائی لے آتا .... ____ وہ بھی طلعت کو کتنا چاہتا تھا۔ حد سے زیادہ طلعت کو خوش دیکھنے کے لئے وہ جان تک کی بازی لگانے کو تیار تھا ..... ایسا کیوں نہ ہوتا ... طلعت جو اس کی اکلوتی بہن تھی ____ امی جان کے چل بسنے کے بعد طلعت ہی اُس کے لئے سب کچھ تھی۔

____ وقت گذرتا گیا۔ دن مہینوں ... مہینے سالوں میں بیت گئے اور وہ منحوس گھڑی بھی قریب آگئی جب کہ طلعت اور حسن کا واحد سہارا بھی اس بے وفا سنسار سے منہ موڑنے لگا۔

ابا جان .... جن سے اُن کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں، اچانک ایک ایسی بیماری کا شکار ہوئے جو آخر میں ان کی اجل ثابت ہوئی۔ طلعت اور حسن کی تمام تر اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ کیونکہ کنبہ کا کفیل وہی ابا ہی تو تھے ____ ابا جان کو بچانے کے لئے حسن نے ساری دولت کا خاتمہ کر دیا کبھی ایک علاج تو کبھی دوسرا .... کبھی ڈاکٹر تو کبھی حکیم ..... لیکن بے سود۔ ابا جان کو نہ بچنا تھا۔ اور ایک اندھیری شب کو اباجی اُن سے روٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ____ حسن کی دنیا برباد ہو گئی۔ اُس کا پھولوں سے لدا ہوا

چمن خزاں کے ایک ہی جھونکے سے ویران ہو گیا۔ اُس کی زندگی میں انقلاب بپا ہوا اور حالت اُس ملاح کی سی ہو گئی۔ جس کی کشتی سمندر میں چھپی ہوئی چٹانوں کی طرف جا رہی ہو۔ اور جہاں بربادی منہ کھولے کھڑی اُسے تباہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو۔

والدین کے چل بسنے کے بعد طلعت ہی حسن کے لئے سب کچھ تھی۔ وہی اُس کا انمول سہارا تھی اور صرف طلعت ہی حسن کی بربادیوں کو دور کر کے ایک درخشاں دور پیدا کر سکتی تھی — حسن نے بھی اپنی چہیتی بہن کی زندگی بنانے کے لئے اپنی نامراد زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ طلعت کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے بہن کے پژمردہ چہرے پر مسرت کی لہر دیکھنے کے لئے ہر عہد کو نبھایا۔ وہ چاہتا تھا کہ طلعت والدین کی کمی کو محسوس نہ کرے ...... لیکن حسن اُس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ بہن کے ہونٹوں پر ہنسی نہ لا سکا۔ طلعت کی صحت اباجان کے چل بسنے کے بعد روز بروز گرتی چلی گئی ...... ڈاکٹروں نے ٹائیفائیڈ بتا دیا — حسن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے دل پر جیسے بجلی گرنے لگی۔ اور جگر پہ ہتھوڑے .... اُس نے بہن کو بچانے کے لئے ہر ایک راستہ اپنایا۔ درویشوں، حکیموں اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کے دروازے کھٹکھٹائے .... آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر پہاڑی مقام کا سہارا لیا .... لیکن قسمت سامنے کھڑی حسن کے کرتوتوں پہ ہنسی اُڑا رہی تھی .... طلعت روز بروز لاغر ہوتی چلی گئی — آف! اُسے بچانے کے لئے حسن نے کیا کچھ نہیں

کیا..... کبھی قلی بنا..... کبھی ہوٹل میں کام کرتا رہا اور کبھی کچھ —— اُسے جو کچھ بھی ملتا سب طلعت کی دوائی پر صرف کرتا۔ لیکن طلعت کی موت نے بھائی پر ترس نہ کھایا۔ وہ برابر طلعت کی نس نس میں سمانے لگی۔ آخر ظالم اُسے ڈسنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

کس قدر اندوہناک اور پُر از حسرت تھا وہ منظر جبکہ حسن کا آخری سہارا ابھی اُسے اس دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے اکیلا چھوڑ کر جا رہا تھا —— طلعت نے اپنی رُکی ہوئی زبان سے کس طرح کہا تھا۔

"بھیّا! میرے پیارے بھیّا! میں زندگی میں تمہاری خوشی نہ دیکھ سکی۔ میں تمہارے ہونٹوں پر شادمانی کی تہہ نہ جما سکی..... بھیا! تم نے میری خاطر جتنی بھی مشکلات اٹھائیں وہ اور کوئی نہیں اُٹھا سکتا..... بھیّا وعدہ کرو! میرے مرنے کے بعد تم کبھی آنسو نہ بہاؤ گے..... وعدہ کرو! میری خواہش!!"

اس کے ساتھ ہی حسن نے طلعت کے منہ پر ہاتھ رکھا اور رو کر کہنے لگا۔

"میری زندگی! خدا کے لئے ایسے دل شکن کلمات منہ سے نہ نکالو۔ طلعت تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی..... بہن، اللہ مجھ پر اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی بھی میرا آخری سہارا نہیں چھینے گا..... تمہیں زندہ رہنا ہوگا..... ہاں، ہاں تم زندہ رہو گی..... اپنے بھیّا کے لئے تمہیں زندہ رہنا ہے۔ بہن اللہ جانتا ہے۔ تیرے بغیر میرا اور کون ہے۔ جو سُکھ دُکھ میں میرا ساتھ دے.....

طلعت تمہیں میری زندگی پکار رہی ہے۔ واپس آؤ !!! طلعت تمہیں بھیا کا پیار پکار رہا ہے۔ واپس آؤ !!!"

لیکن آہ! اس وقت حسن کی فریاد کام نہ کر سکی اور دعائیں بے اثر ثابت ہوئی۔ افسوس! انسان نے انسان کو ہلاک و برباد کرنے کے لئے آلے ایجاد کر لئے لیکن موت کے چنگل سے بچانے کے لئے ایک بھی آلہ ایجاد نہ کر سکا۔ اور صبح اذان کے وقت طلعت نے بھائی کی شکستہ حالی پر مایوسانہ نگاہ ڈالی۔ اور اس کی معصوم رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ___ حسن کا آخری سہارا کیا گیا چراغ حیات بُجھ گیا ___ اُس کے دل کا چراغ بھسم ہو کر رہ گیا...... اس کی حالت زندہ لاش کی سی ہو گئی۔۔ زندہ لاش ......

آج طلعت کو مرے ہوئے دو مہینے گذر گئے اور حسن کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی ہے۔ لوگ اُسے پاگل کہہ کے خوش ہوتے ہیں .....

پاگل.... بہن کی محبت میں پاگل ___ حسن سوچنے لگا۔ "کیا وہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہے .... نہیں .... لیکن پھر یہ لوگ اور ....."

___ اتنے میں بچوں کی ایک ٹولی اُسے اپنی طرف آتی دکھائی دی ... وہ اُٹھ کر چلتا بنا ... بچے اُسے "پاگل" "پاگل" کہہ کے پیچھا کرتے تھے۔ شاید حسن اُن کے لئے ایک کھلونا ہی تھا۔ جس کے ساتھ وہ کھیلتے تھے ___

لیکن وہ کیوں کر جانتے کہ یہ پاگل نہیں بلکہ اجڑا ہوا انسان ہے۔ جس کی حالت والدین کے بعد بہن کی موت نے پاگلوں کی سی بنا دی ہے۔ ●●

بيت

سرِ شام دفتر سے آیا۔ تو برآمدے میں ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر حیران ہوا اور حیرانی کے عالم میں غرق سوچنے لگا۔ کہ میرے ہاں نہ بیوی ہے اور نہ کوئی بہن ..... اکیلا یہاں رہتا ہوں اور نہ ہی کسی لڑکی سے ایسے مراسم پیدا ہوئے ہیں کہ وہ میرے کوارٹر میں بلا بغیر اجازت چلی آئے۔ حقیقتاً میں خود لڑکیوں سے میل ملاپ میں شرمیلا فطرتاً واقع ہوا ہوں۔ کلب میں گو بہت سے حسین و شوخ چہروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ مگر وہ سلسلہ رسمی گفتگو سے آگے نہیں بڑھتا۔ میں نے آج تک آزاد ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرے چند دوستوں کی بہنیں بھی ہیں جو مجھ سے پردہ نہیں کرتیں۔ مگر وہ آتی جاتی ہیں تو اپنے بھائیوں اور شوہروں کے ساتھ .... پھر .... پھر یہ کون ہو سکتی ہے؟

وہ نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ سانولا رنگ، نمکین چہرہ، کالی کالی چمکدار آنکھیں، برسات کی راتوں کی طرح سیاہ اور گھنی زُلفیں۔ اس کے لباس میں بلا کی سادگی تھی اور چہرہ خوشی سے لبریز۔

"تشریف رکھیئے۔" اس نے ترنم آواز اور بے تکلفانہ لہجہ میں کہا۔

"مگر آپ۔" میں آگے بڑھنے سے رہ گیا۔

"آپ کے باورچی کو میں نے بازار بھیج دیا ہے۔" وہ زیر لب مسکرائی۔ اس کے اس بے تکلفانہ جواب نے مجھے ششدر کر دیا۔

"اس وقت آپ چائے پیتے ہیں یا کافی؟" اور وہ اندر جانے لگی۔

"ٹھہریئے۔" میری زبان رک گئی اور اس نے قدم ساکن کر دیئے۔

میں اس مسئے کی عقدہ کشائی نہ کر سکا۔ یہ لڑکی کون ہے جو خود بخود میرے لئے کام کرنے پر آمادہ ہو رہی ہے اور اس نے میرے طباخ کو بازار بھیج دیا ہے۔ میں ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

"میرا خیال تھا کہ برج کرشن نے آپ کو لکھ بھیجا ہوگا۔ وہ تو کہتے تھے کہ وہ آپ سے سب کچھ طے کر گئے ہیں۔" وہ بولی اور اندر چلی گئی۔ واقعات بجلی کی سُرعت کے ساتھ میرے ذہن میں کوندے۔

"اوہ تو آپ ہیں وہ۔ میری حیرانی فوراً دُور ہو گئی۔ کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ میرا مُنہ بولا بھائی (برج کرشن) مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ نکلا تھا۔ اور باتوں ہی باتوں میں اُس نے پوچھا تھا۔

"بھئی کب تک اکیلے رہنے کا ارادہ ہے؟"

"دنیا میں اکیلے آئے تھے اور اکیلے ہی واپس جائیں گے۔" میں نے ہنستے

ہوئے جواب دیا۔

"میرا مطلب تمہاری شادی اور ازدواجی زندگی سے ہے حسن! اس پہلو پر کبھی سنجیدگی سے گفتگو کیا کرو۔" برج جیسے برس پڑا۔

"تم اپنی خیر مناؤ برج۔ اپنے ساتھ مجھے بھی اس جہنم میں ہی دھکیلنا چاہتے ہو۔"

تم جسے جہنم کے نام سے پکارتے ہو۔ بھگوان کی سوگند وہ جہنم نہیں سورگ ہے۔ یقین کرلو۔ جب دفتر سے تھکا ماندہ آتا ہوں تو بیوی کی پیار بھری نظریں اور میٹھی میٹھی باتیں تمام تھکاوٹ اور مایوسی دور کر دیتی ہیں۔ اس کے پوتر پیار میں کھو کر سچ مچ دفتر کی بے کیف مصروفیات کو بھول جاتا ہوں۔ گھر بالکل جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔" اس پر میں نے کہا تھا۔

"تم تصویر کا ایک ہی رخ پرکھے فیصلہ سناتے ہو۔ اور دوسرا رخ نظر انداز کر رہے ہو برج۔ گھر کی چار دیواری ایک قید خانہ اور زنداں ٹھہرا۔ بات بات پر روک ٹوک اور باہر نکلنے کی ممانعت۔ اس کے برعکس اپنے یہاں دن ہو یا رات کا اندھیرا۔ جب بھی جی چاہا آتے ہیں اور جی چاہا چلے جاتے ہیں۔ اپنی مرضی کے آپ مالک ہیں۔ نہ بیوی کی فرمائش ہے نہ گھر کی دیکھ بھال۔ زندگی بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔"

"یہ سراسر خود فریبی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ حسن تمہیں اطمینان قلب کبھی حاصل نہ ہوگا۔ کل اور قرار کا ساتھ نہ ملے گا۔ تم لڑکیوں کو دیکھتے ہو۔ ان سے ملنے کی کوشش کرتے ہو۔ گھنٹوں ان کے متعلق سوچتے رہتے ہو۔ کئی ایک سے انتہائی قرب حاصل کرنے کی سعی اپناتے ہو۔ اور کبھی بدنام بھی

ہو جاتے ہو۔ لیکن برادر ادھر دل کی صرف ایک ملکہ ہے۔ فقط ایک ہی گرد تصورات گھومتے ہیں۔ صرف ایک ہی کا سچا پیار و ہمدردی ساتھ دیتی ہے۔ تم میرے دل کی خوشی کا اندازہ کبھی نہیں کر سکتے۔"

"بہت خوب برج بھیّا۔ تم تو اچھے خاصے فرمانبردار خاوند بن گئے ہو۔ باقی رہا میں۔ میرے نزدیک شادی پیارے عذابِ مسلسل سے کم نہیں۔ میں پابند ہو کے رہنا نہیں چاہتا۔" اور برج عتاب و ترشی کا مجسمہ بنے گویا ہوئے تھے۔

حسن تم قانونِ قدرت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ تم پر لازم ہے کہ سیدھے راستے پر چل کر گرنے سے بچو۔ ناپاک ارادوں کی رَو میں بہہ کر اپنے لئے کوفت و درد کا سامان تیار نہ کرو۔ نہ ہی ضمیر کو پلید کرو۔ بھگوان کے حکم کی تعمیل میں سرتابی اپنائے اس کی نگاہ میں اپنے کو گنہگار نہ کہلاؤ اور نہ ہی ادبیب روی کا ہدف بنے ندامت کا نشانہ بنو۔"

"سادھو مہاراج! اس پند و نصیحت کو ڈالو چولھے میں ...... ہاں تو آج کل کیا ٹھاٹھ ہیں؟" میں نے موضوعِ کلام بدلنا چاہا تھا۔

"تمہارا بحث سے گریز شکست کا اعتراف سمجھوں۔"

"شکست کون تسلیم کرتا ہے۔ یوں تو دھکے سے منوانے کی سوچ رہے ہو۔ بھائی میرا فیصلہ اٹل ہے۔ پتھر پر لکیر۔ بہر کیف تمہاری نصیحت کا شکریہ! ہاں تو بھابی کو میرے ہاں کب لاؤ گے؟ جی اُسے دیکھنے کو چاہتا ہے۔"

"جب تمہاری بیوی آجائے گی اُسی دن بھابی کے درشن کر سکوگے۔"

"برج تم کس قدر شکی ہو۔ ہر شادی شدہ کی طرح۔ مجھے تم سے ایسی امید

نہ تھی۔"

"تمہاری تشنہ نگاہوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر میں بھائی ہونے کے علاوہ تمہارا دوست بھی ہوں۔" اور برج کہہ اُٹھا تھا:۔ "دوستی کی آڑ زیادہ خطرناک ہے۔"

"صاف گوئی کی داد دیتا ہوں برج۔ مگر ابھی میں اس درجہ کمینہ نہیں ہوا۔ برج مجھ سے ملنے آئے تھے اور بات اس قدر سنجیدہ ہو گی۔ خیر ..... اچھا ہوا۔ کہ خادم چائے لے آیا۔ جو برج کو مطلق پسند نہ آئی اور میں نے معذرت کے طور پر کہا۔

بھائی نے الحال ایک طباخ تو بھجوا دو۔ میرا باورچی تو تمہارا مرید ہے۔ اُس نے قانونِ قدرت کی تعمیل کی ہے اور آئے دن اُس کی بیوی بیمار رہتی ہے۔ کبھی بچوں کو نہ کام ہوتا ہے اور سال میں اس کی بیوی جانے کتنی مرتبہ میکے جاتی ہے۔ اس لئے دوسرے باورچی کا ہونا ضروری ہے۔

"کوئی جوان لڑکی چاہیئے۔" برج نے بے تامل جواب میں کہہ دیا اور میں چونک پڑا۔

"لڑکی! کیوں مجھے خواہ مخواہ بنانے کی کوشش کرتے ہو!"

"ارے پگلے بیوی نہیں خادمہ کا ذکر ہے۔" برج جھٹ بول اُٹھا ـــــ

"مگر وہ اس گھر میں رہنا پسند کرے گی؟"

"کیوں ڈرتے ہو ہے بڑی سلیقہ شعار۔"

"کب بھیجو گے ہے۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"بس کسی دن آجائے گی۔"

میں نے برج کی باتوں کو محض مذاق جانا اور بھول گیا۔ اب اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے برج کی ساری باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس نے یہ کیا کر دیا۔ ایک جوان دوشیزہ کو یوں بلا اطلاع بھجوا دیا۔ اب یہ یہاں کیسے رہے گی! لوگ کیا کہیں گے ـــ کوئی بدشکل ادھیڑ عمر کی کوئی لنگڑی قسم کی عورت ہوتی تو بھی کوئی بات تھی۔ میں لاکھ شرافت کی چادر اوڑھ لوں ... کبھی اس لڑکی سے بات نہ کروں۔ مگر لوگ کب مانیں گے۔"

"ابھی آپ تشریف رکھیے، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" میں اس فتنے کو ٹالنا چاہتا تھا۔

"میں آپ کی خادمہ ہوں، مہمان نہیں ہوں جو تشریف رکھوں۔" ... مجھے چکر سا آگیا۔ ایک جوان لڑکی جوان مرد کے گھر میں ... مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا۔ کہ لوگ محلے والے اور دوست احباب اسے میرے گھر میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔

وہ دیوار سے چپیاں کھڑی تھی۔ بجلی کی روشنی میں وہ بالکل ایک کھلا ہوا سنہری پھول معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں کے زیر و بم میں جھانکتے ہوئے مجھے ڈر سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ گھنی پلکیں پھیر اٹھیں جیسے کسی کی تلاش میں تھیں۔

"تو گویا اس گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔" مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا اور میں ٹالنے کے بہانے پیش کر رہا تھا۔

"میں تو انگریزی کھانوں کا عادی بن چکا ہوں۔ آپ تو نہیں پکا سکیں گی!"

"کیوں نہیں سرکار —" میں اس جواب کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے فوراً ایک اور تیر ترکش سے نکال کر اس کی جہت پھینکا — میں کبھی کبھی شراب پیتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اور بہت۔ ۔ ۔ ۔
"سرکار خادمہ کو اس سے کیا واسطہ"۔ وہ بیچ میں بول اٹھی۔
"میں ضرورت سے زیادہ بدمزاج اور تلون مزاج ہوں۔ بعض اوقات نوکروں پر ہاتھ اٹھانے سے نہیں ڈرتا۔" میں نے ایک اور رُخ بدلا۔
"سرکار ایک عورت سے تو یہ سلوک نہیں کریں گے"۔ اس کے لبوں پر دنیا کی مسکراہٹ پھیلنے لگی اور وہ پھر اندر چلی گئی۔ میں اور کچھ نہ سوچ سکا۔ البتہ بحر تحیر میں غرق برج کو کوسنے لگا۔ خیالات میں کھویا بیٹھا رہا۔
"چائے حاضر ہے"۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ اس کے لبوں پر ہنسی سمٹی ہوئی تھی۔ روشنی میں گال انگاروں کی طرح دمک رہے تھے اور آنکھوں میں مسرتوں کے سفینے ڈول رہے تھے۔ میں نے پیالی اٹھا کر لبوں سے لگائی! اس چائے اور باورچی کی چائے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پلیٹیں صاف تھیں۔ پیالی کے کنارے دودھ کی مانند سفید تھے۔ گرم گرم چائے کی بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اس کی طرف مبہم سی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی گوری گوری انگلیاں آنچل سے کھیل رہی تھیں۔ اور میں چائے کی پیالی میں گم ہو گیا۔
"آپ کھانا کب کھائیں گے —؟" میرا مخمور ضمیر چونک پڑا۔
"جب تیار ہو جائے"۔ یکایک میری زندگی بدل گئی — میز پر کھانا کیا

سجا تھا۔ دنیا بھر کی لذتیں آگئی تھیں۔ ہر چیز میں نفاست اور ہر بات لاجواب۔ رات بھر میں سو نہ سکا.... سوچا نوکر رکھ لوں۔ جب کوئی اس کی بابت پوچھے گا۔ تو دیکھا جائے گا۔ پھر خیال آیا یہ نوکر.... ان سے تو بھلی۔ خود باورچی روز روز نئی نئی کہانیاں سنایا کرتا ہے۔ اب اس لڑکی کی موجودگی افسانہ بن جائے گا اور میں کچھ بھی فیصلہ بیس بیس میں نہ کر سکا۔

"سرکار ناشتہ تیار ہے۔" میری نیند کو مدھر الفاظ نے توڑا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور میرے روبرو اس کی آنکھیں الف لیلیٰ کی رنگین کہانیاں سنا رہی تھیں۔

"ناشتہ تیار ہے۔" اس نے دوہرایا۔

"میں کتنی دیر تک سوتا رہتا ہوں۔"

میں ناشتہ کرنے میں مصروف تھا اور ذہن خیالات میں پھر الجھ گیا۔ "یہ لڑکی کون ہے۔ برابر مدھو مکھی کی طرح لگاتار کام کیا کرتی ہے۔ یہ کون ہو سکتی ہے۔ برج نے مذاق کیا ہے شائد کوئی مصیبت زدہ ہو اور اس نے مدد کی ہو...... لیکن میں نے ابھی تک اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ نہ جانے وہ کیسے سمجھ گئی میرے سوچنے کو، خود بولی۔

"آپ کی خادمہ کا نام پشپا ہے۔ کہئے کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

میری زندگی سرے سے بدل گئی۔ ایک ترتیب سما گئی زندگی میں۔ گھر میں ایک سلیقہ تھا۔ ہر شے قرینے سے تھی۔ کمروں کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ باورچی بھی بدل گیا تھا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ سوتے جاگتے کا قصہ دوہرایا جا رہا ہے۔ پشپا نے مجھے کبھی موقع ہی نہ دیا کہ میں اس سے کھل کر باتیں کرتا۔

ایک دن جب ڈرائنگ روم کے ملحق کمرے میں میں داخل ہوا تو اسے صوفے پر بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرتے دیکھا اور میں اس کے مطالعہ میں خلل انداز نہ ہوا اور باہر برآمدے میں آ بیٹھا۔ پھر یکا یک مجھے گنگنانے کی آواز آئی۔ میری روح بے چین ہو گئی .... پُشپا میرے دل میں سمائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کون تھی؟ کس ماں باپ کی بیٹی تھی جسے زندہ رہنے کے لئے میرے ہاں نوکری کرنی پڑی۔ پُشپا نے نہ جانے طباخ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ کہ وہ مجھ سے زیادہ اس کا حکم مانتا۔ اور خود پُشپا میرے سامنے ایک ادنیٰ خادمہ بن جاتی تھی۔ اس کے کرتوت و اطوارات دیکھ کر مجھے زندگی میں بلا کی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ ہر بات پُشپا کی مرضی سے۔ ہر بات اس کی اجازت سے اور ہر معاملہ طے اس کی رائے سے ہوتا۔ میں نادانستہ طور پر اسے اپنے تئیں اہمیت دینے لگا تھا۔ میں نے تجزیہ کیا کہ اس کے لہجے میں وقار اور عظمت پوشیدہ ہے۔ کبھی گھنٹوں دل ہی دل میں سوچتا کہ وہ میری خادمہ ہے مگر جانے کیوں اس کی کسی بات کو رد کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن جب دفتر سے گھر لوٹا۔ تو ہر طرف خاموشی اپنا تسلط جما چکی تھی۔ ہر سمت خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ باورچی نے بتایا۔ کہ "بی بی پُشپا چلی گئی ہیں۔"

"پُشپا چلی گئی ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کی دلآویزی اور لچک مجھ سے چھن گئی ہے۔ میں نے باورچی سے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا..... میں ڈرتا تھا۔ پُشپا جا چکی تھی۔ میرا دل جُدائی کا خیال کرتے ہی ڈوب جاتا تھا...... پُشپا چلی گئی تو میں اکیلا کیسے رہ سکوں گا۔ اس کی پرواز

تقدیس خدمت میری روح میں تحلیل ہو چکی ہے۔ وہ میرے دماغ پر مسلط ہے۔ لُشپا کے بغیر یہ گھر.... یہ ماحول سب بے سود اور اُداس ہے۔ اس میں کسی طرح کی رعنائی نہیں۔ اور دلچسپی نہیں۔ ہر شئے پھیکی اور بے رنگ ہے۔

دفتر میں دل نہ لگتا۔ رہ رہ کر لُشپا کا خیال ستاتا۔ کتاب کے صفحے۔ فائل کے کاغذ پر جدھر دیکھتا اُسی کی مسکراتی تصویر نظر آتی۔ گھر میں آتا تو چار دیواری کاٹنے کو دوڑتی۔ مزاج میں چڑچڑا پن سا پیدا ہو گیا۔ جانے کیوں دفتر میں کلرکوں اور گھر میں ملازموں پر بے وجہ ہی ناراض ہو جاتا۔ سب ہی میرے اس خلاف معمول رویئے پر حیران تھے اور جب صبر و ضبط کی حدوں کو میں پار کر گیا تو میں نے اس کی بابت برج کو لکھنا چاہا۔ کہ اُس نے یہ کیا کر دیا؟ مگر برج کیا کہے گا۔ یہی کہ میں شکست کا اعتراف کر رہا ہوں۔ میری حالت ماہی بے آب کی سی ہو گئی اور میں نے خود شکست کا اعتراف کرتے ہوئے برج سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

برج میری غیر متوقع آمد پر بہت حیران ہوا لیکن شش و پنج میں پڑ گیا۔ ہم دونوں بیٹھے کمرے میں باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک لڑکی داخل ہوئی۔

"بھیّا مبارک ہو، میں امتحان میں اول آئی ہوں۔" مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔

"آؤ! شانتا مبارک ہو۔ یہ میرے دوست حسن ہیں۔ ان کے لئے چائے لے آؤ! اور ہاں اپنی بھابی کو ادھر بھیج دینا۔ حسن اُسے دیکھنا چاہتے ہیں"۔ برج

ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔ جلدی میں کمرے کا ایک اور دروازہ کھلا۔ اور ایک مانوس آواز سنائی دی۔

"شاندار کامیابی مبارک ہو" یہ پُشپا تھی۔ اسے ادھر دیکھ کر میری نگاہیں چکا چوند ہو پڑیں۔ میں حیرانی اور پریشانی کے بحرِ بیکراں میں غرق ہونے لگا۔

"ارے حسن۔ تم ڈر گئے۔ یہی تو تیری بھابی ہے" یہ برج بھیّا کی آواز تھی۔

"بھابی پُشپا..... میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ پُشپا بھابی" میری زبان گنگ پڑی۔ مگر یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ برج نے میری زندگی میں — استقامت پُشپا کے ہاتھوں لا کر رکھ دی۔ اور میں زندگی کے مفہوم کو سدا کے لئے بھانپ گیا۔

ناگن

دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہو کر گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ بھابی دلاری نے جو دالان پر بیٹھی بچی ڈمپل کا دل بہلا رہی تھی دیکھ لیا۔ اور ایکدم بولیں "کرشن تمہیں کھانے پر بلا گیا ہے۔ آج اس کے لڑکے جیندر کی پہلی سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ پارٹی ہوگی۔ ہم سب بھی تو جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو" ——— یہ سب کچھ بھابی ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔

مجھے کرشن بذات خود تو اچھا آدمی تھا۔ اور میرے اُس کے ساتھ بہت ہی گہرے چلے آئے تھے۔ اُس کے لئے میرے دل میں بہت اُنس تھا۔ لیکن اُس کی بیوی جے کماری سے مجھے سخت نفرت تھی۔ حالانکہ ایک رشتہ سے وہ میری بہن تھی۔ لیکن پھر بھی میں اُس کی صورت تک نہیں دیکھنا

جانتا تھا اور وہ صرف اس لئے کہ وہ ایک قاتلہ تھی ـــــ میرے ایک عزیز ترین دوست کے خون سے اُس نے ہاتھ رنگے تھے۔ اُس بے قصور کا خون ابھی اس کی گردن پر سوار تھا۔ وہ جاہ وحشمت کی بھوکی اس قابل بھی نہ تھی کہ اُسے عورت کہا جا سکے۔ لہٰذا میں نے بھابی سے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"بھابی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر مجھے ایک ضروری کام پر بھی جانا ہے۔ اسلئے آپ لوگ ہی پاپا جی کے ساتھ ہو آئے"۔

بھابی نے تو لیے میری مجبوری سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن بہن شانتا میری اس دعوت میں شرکت نہ کرنے پر جھٹ بول پڑیں۔

"اگر تمہیں فرصت نہیں اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تو بھی یوں ہی رسمی طور پر تھوڑی دیر کے لئے ہو آؤ۔ نہیں تو ماموں بُرا مانیں گے۔ کیونکہ ان کی یہ شکایت ہے کہ تم اُن کے یہاں کبھی نہیں جاتے۔ اور نہ ہی اُن کی یہاں کسی تقریب میں شرکت کرتے ہو! بھیا آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تو لیے بھی تو یہ دعوت کرشن کی ہے"۔

اب میں بہن شانتا اور بھابی دلاری کو کیا بتاتا۔ کیسے بتاتا۔ یوں ہی ادھر اُدھر کر کے پیچھا چھڑایا اور کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ قمیض اتار ہی رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ کملیش کے فوٹو پر پڑی۔ جو میری میز پر رکھا ہوا تھا۔ یکایک تین سال کا واقعہ میری نگاہوں میں گھوم گیا جبکہ ایک ٹرک سے ٹکرا کر بے بسی کی عالم میں اُس نے جان دے دی تھی اور وہ بھی اُس بے وفا سنگدل کی محبت میں جس کے لڑکے کا جنم دن آج بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ عالیشان دعوت دی جا رہی تھی ـــــ اُس ظالم

اور ناگن صفت عورت نے اُس کی موت پر نہایت ہی اطمینان سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ــــ "بھئی یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے اور پھر موت کا کیا ہے اس میں کسی کا کیا بس۔ وہ چاہے جس ڈھنگ میں آ جائے!"

میں کملیش کی تصویر کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کملیش کی تصویر میں جان پڑ گئی ہو۔ اور کہہ رہی ہو ــــ "ہاں سنتو! کماری ٹھیک کہتی ہے۔ قسمت اور موت پر کسی کو اختیار نہیں۔ اس میں اُس کا دوش نہیں۔ میری قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا ــــ" ساتھ ہی اُس کی ماں کا بھی خیال آیا۔ جو بیچاری ایک کملیش کی موت کے غم میں پاگل ہو گئی تھی اور پھر اسی حالت میں سورگ سدھار گئی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ چھوٹی بہن مدھو آ کر کہنے لگی کہ "بھیا جی ــ جے کماری تمہیں لینے خود آئی ہے۔" اُف اب کیا ہو گا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہا۔ مگر اتنے میں وہ داخل ہو گئی ــــ!

کماری کو دیکھتے ہی ایک دبی نفرت پھر اُبھر آئی۔ میں نے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا اور بیشتر اس کے کہ میں کچھ پوچھوں۔ وہ خود بول اٹھی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

میں بغیر کچھ جواب دیئے دالان میں چلا گیا۔ اور پیچھے پیچھے وہ بھی چلی آئی۔ پاس بیٹھتے ہی اُس نے پھر وہی سوال دہرایا کہ "کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" ــــ اور میرے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ کہ اب تک جیسی کچھ تھی سو تھی۔ لیکن اب زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ میرا مطلب فوراً سمجھ گئی۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

بھرائی آواز میں کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔ بہت نفرت اور اس وجہ سے کہ آپ اپنے دوست کی موت کا باعث مجھے ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں آپ سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے۔ کیا آپ کے دل میں اس بات کی خواہش نہیں ہے کہ آپ کا مستقبل آپ کے حال سے زیادہ اچھا ہو۔ کیا آپ کے دل کو شہرت اور عزت کی تمنا نہیں ہے۔ اور پھر جس طرح ایک مرد ان تمام چیزوں کا متمنی ہے۔ تو اسی طرح ایک عورت بھی ان چیزوں کی خواہشمند ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ خود حاصل کر سکتے ہیں اور عورت خاص کر ہمارے ملک کی عورت۔ آپ لوگوں کی محتاج ہے۔ وہ آپ کی شہرت میں اپنی شہرت اور آپ کی عزت میں اپنی عزت سمجھتی ہے اور پھر ——"

وہ یہ کہے جا رہی تھی۔ اور میں اس کا منہ تک رہا تھا۔ وہ کہہ تو گئی بہت کچھ —— اور میں خیالوں میں غرق ہو گیا تھا۔ یکایک میری نگاہوں میں آج سے ۴ سال پہلے کا واقعہ گھوم گیا کہ یہ وہی کماری ہے جس نے کملیش مرحوم کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا تھا کہ "آج میں کتنی خوش ہوں اور بھگوان وہ خوشی سے بھرپور گھڑی بھی جلد لائے جب آپ اپنے عہد کے مطابق ڈاکٹری کی ڈگری بھی اسی امتیازی حیثیت سے حاصل کریں۔ جس طرح یہ میٹرک کا سارٹیفکیٹ حاصل کیا ہے" اور پھر کملیش کے کاندھے میں اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے بولی۔

پھر ہم دونوں مل کر ایک نئی اور نرالی دنیا بسائیں گے۔ نئی زندگی شروع

کریں گے۔ ہم ہوں گے اور ہماری محبت"
کس انداز سے کہا تھا۔ کتنی محبت تھی۔ کماری کے لہجے میں اور یہی کماری آج یہ نرالی منطق بیان کر رہی تھی۔ میں اس کا چہرہ تکے جا رہا تھا کہ اس کے الفاظوں نے ......
"تو کیا آپ ایک غیر کے لئے اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ دیں گے"
مجھے ایکدم جھٹکا لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ وفعتاً کسی نے کھولتا ہوا پانی مجھ پر ڈال دیا ہو۔ میں چیخ اُٹھا۔
"کماری! اپنی یہ بکواس بند کرو! اور اس سے پہلے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے۔ یہاں سے چلی جاؤ! میری نظروں سے دور ہو جاؤ! میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا"
مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ شہرت و عظمت کی بھوکی آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو معصوم سمجھتی ہے۔ آج اس کے لئے کملیش صرف اس لئے غیر ہو گیا کہ وہ خود ایک معمولی رپورٹر کی بیوی ہے۔ کملیش صرف اس لئے اس کی آنکھوں میں حقیر ہو گیا کہ ظالم زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ایک کامیاب سرجن نہ بن سکا۔ مجھے ہرگز یہ اُمید نہ تھی کہ کماری اتنی بدل جائے گی اور مایا کی پجارن اتنا بڑا ناٹک کھیلنے سے ہرگز گریز نہیں کرے گی اور پھر میں اس کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ کیا واقعی کماری نے کملیش سے صرف اس شرط پر محبت کی تھی کہ وہ پہلے اپنے آپ کو ایک کامیاب شہرت یافتہ انسان بنائے۔ لیکن نہیں یہ تو غلط ہے۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے کماری کو اپنی رازدار سہیلی کملیش سے

یہ کہتے سنا تھا۔ "برج اور کملیش میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ برج کیا مقابلہ کرے گا کملیش کا ___" لیکن جب اُس سہیلی نے کہا ___ "پگلی! یہ تو تمہاری بھول ہے۔ گھر والے تمہاری شادی برج سے کرنا چاہتے ہیں۔ اور برج کی حالت بھی تو کملیش سے اچھی ہے"۔

"تو کیا ہوا ___" کماری نے بھویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"پیسہ ہی کوئی چیز نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے کملیش کو نہ چاہوں۔ میں نے محبت کی ہے اور ضرور کامیاب ہو کر ہی دم لوں گی۔ کوئی بھی میرا ارادہ نہیں بدل سکتا۔" اور پھر اُٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"کانتا بہن! تم ماں سے کہنا کہ مجھے برج کا مزاج اور طریق اطوار بالکل پسند نہیں۔ ایسی شادی سے تو موت بہتر ہے" ___ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کملیش۔ برج اور میں کالج کے پہلے سال میں تھے اور وہ خود میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔ اُس وقت اُس کے پاس شادی اور محبت کے لئے پیسہ اور شہرت کوئی خاص چیز نہیں تھے۔ اور کملیش کو برج پر صرف اس لئے ترجیح دی تھی کہ اُس کی عادتیں خود اس کو پسند تھیں۔ کیا اس وقت کملیش غیر نہیں تھا۔ یا اس وقت اس کو خود شہرت و عزت کی تمنا نہیں تھی۔

کملیش بہت خود دار اور بے لوث طبیعت کا مالک تھا۔ اُس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ انسانوں کے ساتھ محبت جتاتا تھا۔ اس لئے اُس نے عہد کر لیا تھا کہ خلق خدا کی خدمت کرنے کے لئے ہی ڈاکٹر بنے گا۔ اور جب تک وہ اس کام میں کامیاب نہیں

ہو جاتا۔ شادی نہیں کرے گا۔ اُس نے کماری کو بھی اس بات پر رضامند کر لیا تھا۔ لیکن قسمت کی پھوٹی لکیریں کچھ اور ہی بنا رہی تھیں۔ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اِدھر کملیش اپنے اور کماری کے مستقبل کو درخشاں و شاندار بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اُدھر تقدیر اُس کے خیالات کے عالیشان محل مسمار کر رہی تھی۔۔۔ کملیش نے ابھی کالج میں پڑھائی کا ایک ہی سال مکمل کیا تھا کہ اُس کے باپو ایسی بیماری کا شکار ہوئے کہ ساری پونجی اُن کے علاج پر پانی کی طرح صرف ہو گئی۔ جس کے باعث کملیش کی خیالی دُنیا میں زلزلہ آگیا۔ اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا باپو کے لگاتار بیمار رہنے سے اُس کے اُبھرتے ارادے خاک میں مل گئے۔ اور وہ ایسی گرتی ہوئی مالی حالت کے سبب اپنے باپ اور چھوٹے بھائی بہن کے خرچ کے علاوہ اپنی تعلیم کا خرچ نہ برداشت کر سکا۔ لہٰذا وہ پتا کے ہمت دلانے پر بھی ایف ایس سی سے آگے نہ بڑھ سکا اور کالج چھوڑ کر محکمہ آبپاشی میں بہ حیثیت لائن انسپکٹر کے ملازمت اختیار کر لی۔ جس کا افسوس کماری کو بھی ہوا۔ نہ معلوم اس کو افسوس کملیش کی گرتی حالت پر ہوا یا خود کے خیالی محل مسمار ہونے پر۔۔۔!!!

اسی زمانے میں کماری کا ہمسایہ لڑکا کرشن ٹریننگ کرنے کے بعد "ویدر آبزرویٹر" کی حیثیت سے محکمہ ہیلتھ میں تعینات ہو کر آئے اور وہ جب کماری کے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔

ابتدا میں کماری کے رویہ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کا رجحان کرشن کی طرف زیادہ ہوتا گیا۔ جس کا احساس کملیش کو بھی ہوا۔ اور مجھے بھی۔۔۔ لیکن صاف دل ہونے پر کملیش نے ہمت نہ ہاری۔ وہ

برابر محبت کے انتھاہ سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔ اُس کا کہنا تھا کہ "کماری
کرشن کو بھائی کی حیثیت سے چاہتی ہے۔ جیسا کماری نے بھی کہا ہے اور اسی
لحاظ کے سبب وہ کرشن کے سامنے بات کرتے جھجکتی ہے۔" اُف کتنا سادہ پن
تھا کملیش کے ارادوں میں وہ کہتا:۔

"گو میں ایک اعلیٰ ڈاکٹر نہ بن سکا تو کیا ہوا۔ لیکن آبپاشی کا اعلیٰ افسر
بن کر دکھاؤں گا۔ اور بہت جلد محکمہ کے مقابلہ کے امتحان میں بیٹھ اوورسیر
کا رتبہ حاصل کر لوں گا۔ پھر میری بھی عزت ہوگی۔

لیکن یہ سب کچھ تو کملیش کا وہم ہی تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ زمانے کی
بدلتی ہوا اور ہوا کی گردش نے اُسے کچھ بھی نہیں کرنے دیا اور ایک روز جب میں
اُس کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ نہایت ہی غمگین صورت بنائے بیٹھا ہے۔ میرے
سبب پوچھنے پر وہ کچھ نہ بولا۔ اتنے میں دوست اوم کار بھی آ گئے اور جب
ہم دونوں نے ضد کی تو اُس نے نہایت ہی غمگین نگاہوں سے ہمیں دیکھ کر کچھ
بولنے کی کوشش کی۔ مگر بول نہ سکا۔ صرف آنسوؤں کے چند قطرے اُس کی
آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ لیکن کافی ہمت اور دلاسہ دلانے کے بعد کملیش
نے بتایا کہ جب وہ دفتر سے واپسی پر کماری کے یہاں گیا۔ تو وہ اپنے کمرے
میں بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ یہ اپنی عادت کے موافق اندر چلا گیا لیکن جب کماری
کی نگاہ اس پر پڑی تو اس نے غصے سے پوچھا کہ۔

"تم کس کی اجازت سے کمرے میں داخل ہوئے"۔

یہ کملیش کے لئے انوکھا سوال تھا۔ جسے سن کر وہ چکرا گیا۔ لیکن فوراً ہی
اس کو مذاق تصور کرتے ہوئے سنبھل کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

پوچھا۔

"کیوں! کیا آج نیا قانون نافذ ہو گیا ہے۔"

جس کے جواب میں کماری نے اُس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور بیہودہ اور بدتمیز کہتی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئی —— آج کماری نے اُسے تھپڑ مارا۔ جس کا سر ہزاروں دفعہ گود میں لے کر محبت کا دم بھرتی تھی —— اس واقعہ کا مجھ پر بہت ہی گہرا اثر ہوا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا۔ پانی سر سے گذر چکا تھا —— اور اس کے علاوہ کیلاش کو کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کماری کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنا دھیان کسی اور طرف لگائے۔ رات کافی دیر تک اومکار اور میں اُسے سمجھاتے رہے —— اور صبح دفتر جاتے وقت جب میں کیلاش کے ہاں گیا۔ تو دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھا ہے اور اس کی بہن کانتا ناشتہ لئے کھڑی اُسے سمجھا رہی ہے۔ لیکن کیلاش کچھ بولتا ہی نہیں۔ یہ سماں دیکھ کر اور کیلاش کی مرونی حالت کا جائزہ لینے پر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے جگر پر ہتھوڑے مار رہا ہو۔ لیکن وقت کی نزاکت خیال میں رکھتے ہوئے میں نے بھی اُس کی بہن کے ساتھ مل کر سمجھا بجھا کر ناشتہ کرا کر اُسے دفتر بھیجا۔

شام کو جب میں اومکار کے ساتھ گھر کی طرف آ رہا تھا۔ تو دور سے دیکھا کہ کیلاش سر جھکائے زندہ لاش کی طرح آ رہا ہے۔ ہم نے اُس کے پاس پہونچنے کے لئے سائیکلیں تیز کیں۔ اور قبل اس کے کہ ہم اس کے پاس پہنچ سکتے کہ سامنے سے ایک ملٹری ٹرک پوری رفتار سے آئی۔ اور ڈرائیور کی ہزار کوششوں کے باوجود نہ رک سکی ——
میں یہ ضرور کہوں گا کہ ڈرائیور نے اس حادثے سے بچنے کے لئے

کافی ہارن دیئے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں کیش نہ سن سکا۔

کیش جب ٹرک سے ٹکرا کر گرا تھا۔ تو اُس کے مُنہ سے "ہائے ظالم" نکلا۔ نہ معلوم اُس نے ظالم کس کو اور کیوں کہا تھا۔ بہر حال اونکار اور میں اُسے اُٹھا کر گھر لائے۔ وہ بالکل بے ہوش تھا اور کافی کوشش کے باوجود دیر تک ہوش میں نہ آ سکا۔ آخر قریب دس بجے رات اُس کے مُنہ سے ہلکی سی آہ نکلی۔ وہ بہت ہی نحیف آواز میں بڑبڑایا ــــ

"تجھے کماری نردوش ہے۔ اُس . . . . . کا . . . . . کوئی دوش نہیں . . . ہاں قصور . . . . میری . . . . قسمت . . . . . اــــ تاریکی میں ایک کرن چمکی تھی۔ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس خیال سے کہ شاید کماری کی موجودگی اور تیمار داری اس کے کچھ کام آ سکے۔ اُس کے گھر کی طرف چلا تو کمرے میں سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ کماری کرشن کے پاس صوفہ پر بیٹھی تھی۔ کرشن کہہ رہا تھا۔

"ہاں کماری کیش کی حالت واقعی نازک ہے۔ بھگوان کرے وہ بچ جائے۔ بیچارہ بہت ہی شریف آدمی ہے"۔

کماری نے اُسی حالت میں بیٹھے بیٹھے گردن ہلائی ــــ

"ہونہہ! بے وقوف کہیں کا . . . . بھلا جب کوئی خود موت کے مُنہ میں جائے تو دوسرا کیا کرے"۔

"اُف! دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ کیا یہ وہی تھی جو کیش سے کہا کرتی تھی کہ "بھگوان کے لیے تم سائیکل تیز نہ چلایا کرو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا حال ہو گا"۔

میں وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا اور جب کیش کے پاس واپس آیا تو دیکھا لاغر بالپوا اور بہن کا نتا اُس کے پلنگ سے سر پٹخ پٹخ کر اُسے آوازیں دے رہی تھیں۔ مگر وہ کیا سنتا! ۔ وہ بہت دُور جا چکا تھا۔ میں بھی پاگلوں کی طرح اپنے عزیز دوست کی جُدائی محسوس کر رہا تھا۔ اور خوب رویا۔ اتنے میں اومکار نے ایک خط ہاتھ میں دیا جو کیش نے جان دیتے وقت اُسے مجھے دینے کے لئے دیا تھا۔ خط تو اُسی ناگن کے نام تھا۔ جس کی خاطر کیش نے اپنی زندگی دی!!!! اب بھی وہ خط میرے پاس ہے اور ہمیشہ اُسے اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ لکھا تھا:

"جانِ من! میں ہر ایک بے عزتی برداشت کر سکتا۔ لیکن تم نے میری خودداری کو چیلنج کیوں دیا۔ میں غریب سہی لیکن بے حیا نہیں۔ یاد ہے تم نے کسی وقت کہا تھا "تم ششو اور اومکار کے ساتھ کیوں پھرتے ہو۔ اُن کے اخلاق گندہ اور خیالات فرسودہ ہیں۔ تم اُن کا ساتھ چھوڑ دو"۔۔۔ میرے دل میں آیا کہ میں کہوں۔ جس کے ساتھ تم رات دن تصوراتِ خیالات اور حقیقت میں پھرتی ہو اُس کا اخلاق ۔۔۔۔۔ میں اب بھی کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں بچھو نہیں! میری عادت ڈنک مارنا نہیں۔ تم نے میری محبت کو ٹھکرایا۔ میری خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ خلافِ اُمید ششیہ دل چُور چُور کر دیا ۔۔۔۔۔ افسوس تم نے مجھے محبت بھری انکھیوں سے دیکھا ہی کیوں تھا۔ تم نے اپنی زلفوں کو پریشان کیا ہی کیوں تھا۔ میں تم سے اتفاقاً محبت کی بازی ہار گیا۔ مگر تمہارے اخلاق سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرو گی۔ جیسا ایک ہارے ہوئے آدمی کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔۔۔۔ اب میں جان گیا ہوں کہ تمہارے سینے میں

محبت بھرے دل کے بجائے سخت پتھر کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ جس کو میرے آنسو بھی نہ پگھلا سکے۔ آج خانۂ دل میں اُمیدیں ماتم کر رہی ہیں۔ خوشیاں گوشۂ تنہائی میں آنسو بہا رہی ہیں اور میں خود محوِ حیرت ہوں۔ کس کس کو سمجھاؤں۔ کس کس کو تسلیاں دوں .... کیا میں وہ ایام گذشتہ بھلا سکتا ہوں جب تمہاری ہر نظر مجھے دعوتِ محبت دیتی تھی۔ تمہارا ہر لفظ میرے دل میں جگہ کر لیتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ میں نے تمہیں دردکا درماں کیوں کر سمجھا۔ تم تو زہر تھے تریاق کیوں کر سمجھا۔ میں نے جانا تھا کہ تمہارے سہارے میری کشتیٔ حیات کنارے لگے گی۔ لیکن تم نے بھنور میں ڈبو دیا ــــ افسوس تمہیں کھو کر میں نے سب کچھ کھو دیا۔ میری خوشیاں تم نے لوٹ لیں۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اُس بے بس کو لوٹا جس کو تم سے اُمید تھی۔ کہ اُس کی خالی جھولی گوہرِ محبت سے بھر دو گی ــــ تمہارے وعدے کیا ہوئے۔ آج تمہیں گذشتہ باتیں یاد نہیں آئیں گی ــــ آج اس خط کو شروع کئے تیسرا روز ہے۔ چند سطریں لکھتے ہی میرا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ آنکھیں اُمڈ آتی ہیں اور دل کھول کر جب تک رو نہ لُوں چین نہیں آتا ــــ ہاں تو یہ دولت و ثروت جاہ و حشم، جس پر تمہیں غرور ہے، تکبر اور گھمنڈ ہے۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ دنیا بے ثبات اور دولت ناپائیدار ہے۔ تمہاری نظر میں وہ سب کچھ ہے۔ جس کے پاس دولت ہے اور جس کے پاس دولت نہیں وہ آوارہ اور بدتمیز ہے ــــ میں تنہا ہوں۔ موت میرے سامنے منڈلا رہی ہے۔ آؤ کماری دیکھو میری حالت کیا ہو رہی ہے۔ میں سب کچھ کھو چکا ہوں۔ میں ساری دنیا کو ایک جلتا ہوا مرغزار دیکھ رہا ہوں .... اچھا ... خدا حافظ"

(کملیش)

مجبوری

شام کا سہانا اور دل آویز وقت تھا۔ دن بھر کی مسافت سے تھکا ہوا سورج اپنی آرام گاہ کی جانب تیزی سے گامزن تھا۔ سرسبز پتیوں سے لدی درختوں کی شاخوں پر خوش الحال پرندے نغمہ خواں تھے ..... مگر احسن اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ خاموش اور اداس اداس سا..... اس کی کتابی پیشانی پر ہلکے ہلکے بل پڑے ہوئے تھے۔ اس کی بوجھل آنکھیں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے کسی گہرے سوچ میں مستغرق ہو۔ کبھی وہ سرہانے پر رکھے ہوئے رسالے کے سرورق پر بنی تصویر کے سوز و گداز میں جھانکنے کی سعی کرتا تو کبھی اس رسالے کی ورق گردانی کرتا اور پھر زور سے رسالہ پلنگ پر پٹک دیتا۔ گویا وہ اپنے خیالات کو منتشر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جب کسی طرح سے چین نہ ملا تو احسن اٹھ پایا

ہی پڑے ٹرانزسٹر کا بٹن دبا دیا سو

اور بھی دکھ ہے زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ!

اُف گانے والے کی آواز میں غضب کا لوچ تھا.... درد تھا۔ احسن کو ایسا لگا کہ غزل کے سانچے میں کسی نے اسکی آپ بیتی کو ڈھال دیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے گئے.... بے مول آنسو.... اُس نے خود کو پلنگ پر گرا دیا۔ گولڈ فلیک کا سگریٹ سلگائے کش پر کش لینے لگا اور مرغولے چھوڑنے لگا.....
کش پر کش..... ایک کے بعد دوسرا سگریٹ.... حتیٰ کہ کمرے کا بالائی حصہ دھوئیں سے مکمل بھر گیا۔ وہ اس دھوئیں سے اٹے پڑے حصے کی جانب جھانکنے لگا.... بغور اور دل لگا کر..... سوچتے سوچتے اور جھانکتے جھانکتے ماضی کے خیالات یکے بعد دیگرے فلم کی طرح تحت الشعور میں رینگنے لگے اور گیا گذرا ایک ایک سین آنکھوں کے سامنے آگئے جن کا اُس کی زندگی سے گہرا تعلق تھا..... ایک دن کی بات ہے وہ شہر کے بے ہنگم ماحول شور و غل سے تنگ آکر پاس والے گاؤں کی جانب نکل پڑا..... پیچ و خم کھاتی پگڈنڈی پر..... دیہات کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں جسم سے مس ہو کر عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ وہ گنگناتا ہوا آگے بڑھے جا رہا تھا کہ برفانی نالے نے راستہ روک لیا..... وہیں پہاڑی کے دامن میں طرح طرح کے پھولوں سے اٹے پڑے کنج میں وہ جا بیٹھا اور قدرت کی رنگینیوں کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اچانک "بابو جی سانپ" کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک موذی سانپ

پھن پسارے اپنی بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا۔ احسن لپک کر اُس جانب ہو لیا۔ سامنے ایک لڑکی تھی۔ جس کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور سانس بُری طرح پھول رہا تھا۔ احسن نے آن واحد میں کوٹ کو اُتار کر دوسری جانب جھاڑیوں میں سانپ کا دھیان ہٹانے کی غرض سے پھینکا۔ خدا کا کرنا سانپ اُس طرف چلا گیا۔ حالانکہ سانپ چلا گیا تھا۔ مگر لڑکی اس کی موجودگی سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اب بھی اس کی نگاہیں سانپ کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"آپ"۔ احسن نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری جان بچائی"۔ لڑکی واپس گویا ہوئی۔

"جی یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا.... خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ بچ گئیں"۔ احسن کی زبان پھر کلام کر گئی —— جواب میں لڑکی اپنے ڈوپٹے کا گلابی آنچل ہاتھوں میں لے کر ملنے لگی۔ اس کا سڈول جسم جھینی کُرتائی سے جھانک رہا تھا۔ لڑکی نے عالم سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب چلیں"!

"میرا کوٹ"

"ارے ہاں" لڑکی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور خود جھپٹ کر جھاڑیوں میں سے کوٹ لانے کے لئے دوڑی .... اور شان بے نازی کے ساتھ کوٹ کو احسن کے کاندھوں پر ڈالے ..... اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ باد خنک کے جھونکے آنے لگے اور برسات کی راتوں کی سیاہ دلکش زلفیں فضا میں

پرواز کرتی تھیں۔ کبھی کبھی بالوں کی لٹیں اس کے رُخِ روشن پر آجاتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ سیاہ بادل کے ٹکڑے نے چاند کو ڈھانپ لیا ہو۔ وہ دونوں مدہوش چلے جا رہے تھے کہ دراہے نے اُنہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب دونوں کا راستہ الگ الگ تھا۔ احسن شہر کی جانب اپنے دل میں لاکھوں حسرتیں لے کر روانہ ہوا اور وہ گاؤں کی طرف چل دی۔

دوسرے روز غیرارادی طور اُس پہاڑی کی طرف گیا اور خلافِ توقع اس لڑکی کو دیکھ کر احسن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

احسن کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"آپ"

"ارے ہاں" احسن نے خود ہی جواب بھی دیا۔

"لیئے اپنا تعارف کرائیں۔ مجھے احسن کہتے ہیں۔ اور آپ ....."

"جی مجھے نزہت کہتے ہیں"۔ لڑکی نے فقرہ مکمل کر دیا۔

"نزہت"— احسن نے زیرِ لب نام کو دہرایا۔ "کتنا پیارا نام ہے آپکا"۔

اور نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں .... دن بیت گئے .... دونوں کی ملاقاتیں رنگ لانے لگیں!

دونوں نے ایک دوسرے سے پیار نبھانے کے عہدو پیمان باندھے۔

ایک شام احسن باغ میں بیٹھا "شعلۂ عشق" کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ کہ نزہت تمام رعنائیوں سے مزین آئی اور احسن کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے نزہت کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھالیا۔

"نزہت میں تمہارے لئے ایک تحفہ لے آیا ہوں۔ کیا قبول فرمائینگی۔"
"خوب بغیر دیکھے کیسے قبول کر دوں" نزہت نے چھیڑنا شروع کیا۔
"اچھا تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو" اور نزہت نے فرماں بردار لڑکی کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔ احسن نے اپنا لایا ہوا تحفہ اس کی حسین حنائی انگلی میں پہنا دیا اور فرط محبت میں اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اُن کے دل بُری طرح سے دھڑک رہے تھے۔ انہوں نے ہم زبان ہو کر اپنی محبت کو امر و زندہ جاوید رکھنے کی قسمیں کھائیں۔ اور الفت کی نگری کو ایک ساتھ آباد کرنے کی بابت سوچا.... کتنا حسین تخیل تھا اُن کا۔
"اب ہم جلدی اپنی شادی کریں گے" احسن نے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے کہہ دیا۔
"شادی" یہ لفظ سنتے ہی نزہت کا خوبصورت چہرہ اور زیادہ تمتما اُٹھا۔ شرم حجاب کے دھارے اس کے گالوں پر دوڑنے لگے اور چہرہ معصوم کلی کی طرح کھل گیا۔ ساتھ ہی نہ جانے کس جذبے کے تحت اُس کی زبان کام کر گئی!!!

"شہریار جی! شادی کے لئے تو آپ کو میرے اباجی سے ملنا ہوگا.... یاد رکھنا ریٹائرڈ کرنل ہونے کے ساتھ ساتھ مزاج کے بھی تیز ہیں۔ اس لئے ہر بات محتاطی سے کرنی پڑے گی۔ ویسے میں بھی اپنی طرف سے کوشش کروں گی۔"

—— اگلے روز حسب معمول شام کو احسن مخصوص جگہ پہ گیا۔ بہ خلاف توقع نزہت نہ آئی ...... وہ انتظار کرتا گیا۔ لیکن بے سود۔ وہ رہ رہ کے اُس کے دماغ میں یہ بات رقص کرتی کہ کہیں نزہت کے دشمنوں کو کچھ

ہو تو نہیں گیا ...... وہ با دلِ نخواستہ اٹھا اور شہر کی جانب چل پڑا.. .... اور پھر کہیں روز سورج نکلا اور پھر غروب ہو گیا۔ لیکن احسن کی نظروں میں ہمیشہ .... اندھیرا چھاتا رہا۔ ایک دن جب وہ صبح اُٹھا تو اس کا سارا بدن حرارت سے تپ رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا ...... وہ دفتر بھی نہ جا سکا ..... دن بدن اُس کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ جو اس کے درد کا مداوا کر لیتا۔ اس بد حالی کے باوجود بھی اُس کی زبان پر نزہت کا نام رہتا تھا —— ایک روز کمزوری کے باوجود وہ اُٹھا۔ کوٹ کاندھوں پر ڈالے گاؤں کا رُخ کیا۔ اس کا دل اس بار گواہی دے رہا تھا کہ نزہت ملنے آئے گی۔ جائے مخصوص پر انتظار کرنے لگا کہ نزہت آئی۔ احسن نے دونوں آنکھوں کو مَلا جیسے یقین ہی نہ آتا ہو اور پھر وفورِ الفت میں چلایا۔

"نزہت تم آگئیں" —— اور احسن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے بہہ نکلے۔ نزہت کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ وہ ایک ہی جگہ پتھر کی مورتی کی طرح کھڑی رہی۔ اُس کی بھیگیں پلکوں سے پتہ لگتا تھا کہ وہ وہ بھی اپنے دل میں اندوہناک طوفان چھپائے بیٹھی ہے —— احسن لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھا۔ قریب ہی تھا کہ وہ زمین بوس ہو جاتا۔ نزہت نے سہارا دے کر اُسے سنبھال لیا۔ اب اُس کا سر نزہت کی آغوش میں تھا۔

"نزہت تم اتنے دنوں کہاں تھیں" —— احسن کی آواز میں التجا تھی۔

"نزہت بتاؤ! کچھ تو کہو۔ ورنہ میں بے موت مر جاؤں گا۔ تمہاری

خاموشی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔" نزہت نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"میں ..... میری ..... ۔" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور احسن نے پھر اصرار کیا۔

"کچھ تو کہو نزہت! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"
"جی میری شادی ..... ۔" اور پھر نزہت بچوں کی طرح رونے لگی۔
"شادی۔" احسن نے طنز کیا۔ "ایسے خوشی کے موقع پر کوئی روتا ہے۔ تمہیں تو ہنسنا چاہیئے! دیکھو باغ کی ساری کلیاں بھی مسکرا رہی ہیں۔ اشجار کی ڈالیاں خوشی میں جھوم رہی ہیں۔" تم بھی ناچو نزہت ..... گاؤ ..... خوشیاں مناؤ۔ کیونکہ تم نے میرے ارمانوں کی قبر پر اپنی خوشی کا محل تعمیر کر لیا ہے۔
اور پھر یکدم بہت ہی سنجیدگی سے کہا۔
"نزہت تمہیں میری زندگی کو برباد کر کے کیا ملا۔"
یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری مجبوریوں کو دیکھو۔" نزہت نے جواب دیا۔
تمہاری مجبوری ایک حسین دھوکہ ہے۔ اپنی مجبوریوں کو جتا کر تم میرے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہو ---- میری زندگی کا مذاق اڑانا چاہتی ہو ..... مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ دنیا میری محبت کا منہ چڑائے"
اور یہ کہتے نہ جانے اس لاغر جسم میں طاقت کہاں سے آ گئی۔ وہ اٹھا اور نزہت کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا" ..... دور ..... بہت دور ..... جہاں سماج کا ظالم ہاتھ ہم تک نہ پہنچ سکے ..... جہاں "سوائے محبت اور الفت کے اور کچھ نہ ہو۔"

"خدارا ذرا سوچیئے تو یہ آپ کیا کر رہے ہیں" نزہت نے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کر کے کہا۔ "ہمارے بھاگ جانے سے دنیا کیا کیا سمجھے گی۔ کیا کیا باتیں بنیں گی۔ ظالم سماج ہماری محبت کا منہ نہ چڑائے گا۔ دنیا والے ہماری الفت کو ہوس اور خود غرضی نہ سمجھے گی۔ ایسی ذلت سے تو موت ہی بہتر ہے۔ کیا دنیا والے میرے ماں باپ کا جینا دوبر نہ کرینگے احسن" اور پھر درد بھری آواز میں نزہت نے التجا کی "کیا ہی اچھا ہو تم ہی اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو۔"

احسن سب کچھ سکتے کے عالم میں کھڑا سن رہا تھا۔ آخر اسے نہ رہا گیا اور وہ چیخا۔

"نزہت میں نے بہت کچھ سن لیا اب اور کچھ سننے کی تاب نہیں۔ پیاری نزہت مجھے معاف کردو" ——— اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس کا سر نزہت کی گود میں تھا اور وہ اُس کے بکھرے بالوں میں انگلیوں سے کنگی کر رہی تھی۔

"مالک رشید صاحب ملنے آئے ہیں۔" یہ رمضانے کی آواز تھی۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ماضی کے لمحات دم توڑ گئے۔ اور اب احسن اکیلا پلنگ پر دراز پڑا ہے۔ اور دھوئیں سے اٹا پڑا کمرہ ——— آہ سرد بھر کر اُس نے رومال سے بھیگی پلکیں خشک کر دیں اور پلنگ چھوڑ کر دالان کی جھت چلا ..... مرے مرے انداز میں میں جیسے اُس کا سب کچھ لٹ چکا ہو۔ ساتھ ہی نہ جانے کس جذبے کے تحت اُس نے گنگنانا شروع کیا۔

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

دل کی آواز

"یہ امر واقعہ ہے کہ تم میری محبوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ میری زیست بھی ہو..... زیست کی لذت۔ میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ تم مانو یا نہ مانو! تم میرے اُفق زندگی سے اُبھرنے والے واحد چاند ہو۔ میں تم بن زندگی بتانے یا زندہ رہنے کی بابت بھی نہیں سوچ سکتا —— یقین کرو یا نہیں پر یہ حقیقت ہے کہ تم میرے ہونٹوں کی ہنسی۔ چہرے کی رنگت.... کانوں کی سماعت.... آنکھوں کی بصارت اور دل کی دھڑکن ہو! تمہارے وجود سے میری ہستی وابستہ ہے۔ سچ مانو تم میری رُوح ہو——

کاش یہ الفت سدا اسی طرح زندہ جاوید رہتی۔ میری محبوبہ میں تمہارے بغیر زندگی کا منزل مقصود بھی نہیں پا سکتا۔ تمہیں اپنے قریں نہ پا کے مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی ویرانے میں پڑا ہوں اور جگہ جگہ سے مجھے افعی ناگ کاٹ رہے ہوں

—— اب تو بس آرزو یہ ہے جانِ تمنا کہ یہ فراق اور یہ جدائی قرب اور ہم آہنگی میں بدل کر ہمیں راحت و مسرت سے لبریز ایام بخش دیں۔ یہ دیوار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاش پاش ہو اور ہم سدا کے لئے ایک ہو جائیں۔"

—— کالج سے واپسی پر ڈاکیہ نے تین ملفوف خط ریحانہ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ جن میں ایک اُس کے نام اور باقی والد صاحب کے نام پر تھے ریحانہ نے باجی کے خطوط اُن کے کمرے میں رکھ، سرعت کے ساتھ برآمدہ میں پڑی کرسی پر تسلط جمائے لفافہ چاک کر گئی۔ رشید کا ہی نامہ تھا اور نفسِ مضمون وہی کچھ جو اوپر دُھرایا گیا..... خط پڑھنے پر ریحانہ کی آنکھوں میں انجانی مسرت جاگنے لگی۔ اُسی کی صورت نکھرنے لگی۔ وہ متعدد بار خط کو پڑھتی گئی اور ہر بار ایک نئی خوشی کی لہر سر سے پیر کے انگ انگ میں دوڑنے لگی۔ وہ خط کے مختصر مواد میں اس طرح کھونے لگی جیسے چکوری چاند کو دیکھ کر کھو جاتی ہے..... تصورات کی سطح پر اس خط کا مفہوم پھیلنے لگا۔ جیسے ابرِ غلیظ برسنے کے لئے آسمانی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے..... دیکھتے دیکھتے مراسلے کا مواد ایک داستان کی ... صورت اختیار کئے اُس کے روبرو رقص کرنے لگا..... حال کے نقوش مدھم پڑنے لگے... مستقبل کے سپنے سکڑنے گئے۔ اور ماضی کے دھارے آب و تاب کے ساتھ پھوٹ پڑے..... ریحانہ ایک بار پھر پرانی یادوں میں کھو گئی... مری ماری دو دم سکت یادیں۔ جن میں جان نہیں تھی۔ مگر ڈھارس بھی تھی..... تشفی تھی وہ ایک ساتھ پلے تھے۔ رشید کے والد امجد میاں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے اور فالتو وقت کا بیشتر حصہ ریحانہ کے والد صاحب کے

ہمراہ گذارتا تھا۔ جو ریٹائرڈ کرنل تھے۔ رشید کی ماں بھی ریحانہ کو بہت چاہتی تھی۔ وہ اس لئے بھی اُس کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی۔ مرتے وقت اس نے ریحانہ کو اپنے سینے سے لگایا تھا...... رشید اور ریحانہ نواحی مکتب میں عربی تعلیم ایک ساتھ پاتے رہے...... وہ شرارتیں..... پتنگ بازی...... آنکھ مچولی کھیلنا..... غرض ہر واقعہ اس کے سامنے رقص کرنے لگا...... اور پھر رشید کے والد صاحب کا تبادلہ! رشید نے شملہ جانے سے قبل ریحانہ کو گلے لگایا تھا۔ اور ایک بھرپور بوسہ لڑکپن کی نشانی کے طور اس کے ماتھے پر ثبت کر دیا تھا۔

"ریحانہ رومت..... ایسا کرنے سے میرے حوصلے گھٹ جائیں گے۔ میں تمہیں خط برابر لکھ دیا کروں گا"

اور پھر ریحانہ نے اپنے آنسو قمیض کے دامن میں جذب کرتے کہا تھا۔

"رشید دور جا کے مجھے بھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارے چلے جانے سے لگتا ہے۔ اس شہر کی تمام رونق رخصت ہو جانے لگی ـــ"

"بٹیا..... کرنل صاحب نے چائے پر بلایا ہے۔"...... "رانی بٹیا۔"

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ماضی کے دھارے سمٹ پڑے۔ مستقبل کے سپنے ٹوٹ گئے اور حال کے نقوش واضح انداز میں اُبھر پڑے۔ "یہ خالہ نسرین تھی جس نے ریحانہ کو گود کھلایا تھا"۔

آج ریحانہ سے الگ ہوئے رشید کو تین سال کا عرصہ گذرا۔ اور اسی دوران جتنے بھی خطوط ریحانہ کو رشید کی جانب سے ملے۔ ان کی عبارت میں وہ التفاتِ کشش اور اٹھان نہ تھی جو آج کے اس نامہ میں مضمر تھی۔

آج کے اس اُلفت و انسیت سے لبریز خط نے ریحانہ پر غیر معمولی اثر چھوڑا اور وہ خوشی کے بحر بیکراں میں غوطے کھانے میں محو ہو گئی۔

رشید کو شملہ سے گھر آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گذر گیا۔ .... ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ ریحانہ کے ساتھ کبھی کبھار ملنا ہوا تو وہ بھی اُس التفات کے ساتھ نہیں جس کی ریحانہ کو توقع تھی ..... ریحانہ رشید کے اس غیر متوقع تبدیلی پر سوچنے لگی ..... بہت سوچا ... لیکن وہ رشید کی اس بے مہری کی وجہ نہ جان سکی۔ وہ تو اپنی تمام اُمیدیں رشید سے وابستہ کر گئی تھی۔ آدرانہ والہانہ انداز میں دل کی گہرائیوں سے اُسے چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ رشید اُس سے کھنچا کھنچا رہے ..... اُس کے تحت الشعور پر اُلفت کی چادر بکھری پڑی تھی۔ اس خاطر رشید کا کھچا کھچا اور کھویا کھویا سا رہنا ریحانہ کی سمجھ میں نہ آسکا۔

ایک روز کالج کی گہما گہمی سے فراغت حاصل کیے ... گھر کے بجائے ریحانہ نے رشید کے بنگلہ کا رُخ کیا۔ پوچھ گچھ کرنے پر ماما تارا نے بالائی منزل کے کمرے کا اشارہ کیا اور خود دہلیز صاف کرنے لگی۔

رشید غلام گردش کے ایک کونے میں آرام کرسی پر دراز مست خرام پڑا تھا۔ سامنے سہ پائی پر چند اوراق بکھرے پڑے تھے ..... ساتھ ہی ایک دوشیزہ کی تصویر جسے پہلی بار دیکھ کر ریحانہ سکتے میں آگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اِدھر اُدھر کے خیالات ذہن میں جنم پانے

اُس کا رہا سہا سکون و چین لوٹنے لگے۔ حوصلہ اور ضبط کے دامن کو ہاتھوں سے نہ چھوڑ کے اُس نے پھر سے کاغذات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ رشید کے پہلو میں رائٹنگ پیڈ پڑا تھا۔ اُس نے ہمت سے کام لے پیڈ کو ہاتھ میں اُٹھایا اور نامکمل خط پڑھنے لگی جو رشید لکھتے لکھتے رہ گیا تھا۔

جان سے عزیز مُونا۔

"امید کہ خط تمہیں عافیت سے پائے گا۔ تمہاری جانب سے خط اور پیاری تصویر ملی۔ گو یہ دونوں چیزیں تمہاری طرح مجھے بہلا نہیں سکتیں پھر بھی ذہنی ڈھارس دے سکتی ہیں۔ اس کے لئے شکریہ۔

تمہارا خیال صحیح نکلا کہ میرا دل یہاں نہیں لگتا۔ یقین کرلو مُونا! جب سے یہاں آیا ہوں آرام و سکون مجھ سے دُور ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلا دوں کہ تمہارے نہ ہونے سے سب کچھ سُونا سُونا سا لگتا ہے۔ اس شور سنگم و دلچسپ زندگی سے الگ اس جگہ مصروفیات سے لبریز چیزیں کہاں۔ اکثر تمہارے وہ لطیف گیت سننے کو دل کرتا ہے ..... اور وہ کلب کی رنگینیاں ..... جس کی رنگینی میں کھوئے ہم ایک دوسرے کے ہو کر رہتے تھے۔ وہ سب کچھ اس جگہ کہاں! یقین جانو یہاں کا ذرہ ذرہ مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے ..... یہ لمبے لمبے اُونچے پہاڑ ..... بل کھاتی پگڈنڈیاں ..... رواں دواں ندی ..... قد آدم درخت ..... لہلہاتے کھیت اور یہ سادہ حسن مجھے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ ان لوازمات

سے میرا دل بہل سکے۔

مونا! تم سے الگ نہ چاند اُس وقت خم سے نکلتا ہے اور نہ آفتاب اُس آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوتا ہے ـــــ میں جلد ہی کرایہ داروں سے تصفیہ کر کے واپس آرہا ہوں ...... ہاں تمہارے پاس ... تمہاری خلوتوں میں مخل ہونے کے لئے ..... اب تو تمنا ہے کہ تمہیں سدا کے لیے اپنے سے منسلک کر دوں۔ وہ گھڑی ابدی ملاپ کی کس قدر سہانی اور خوبصورت ہوگی۔ تم سچ مچ زندگی کا ہم پلہ بنے میرے ساتھ آؤگی۔ میری شریک زندگی بن کر اور میرا سہارا بن کر۔

مونا! مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں نے اس لوک میں اگر کسی ایک کو دل سے چاہا ہے۔ وہ تم ہی ہو ...... اور کوئی دوسرا نہیں۔

ہاں تو وہ ریحانہ بگلی اب بھی میرے پیچھے لگی ہے۔ حالانکہ میں کتنے آنکھ ...... ـــــ اس نامکمل خط کو پڑھ کے ریحانہ کے پیچھے ہوش و حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ چاروں اطراف سے مایوسی و اداسی کے قہقہے بلند ہوئے اُسے ترسانے لگے۔ اس کا دل رونے لگا۔ مگر اشک کا ایک قطرہ بھی دیدوں کی راہ نہ بہہ نکلا۔ سکتہ سا طاری ہوا ـــــ خط کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر اس اپنے محبوب کسی کی جنت جفا تکنے لگی۔ جو خواب دیکھ رہا تھا ...... کتنا خوش نظر آرہا تھا۔ اس بار ریحانہ بچوں کی طرح کھل کھلا کر رونے لگی۔ اُس کی آرزوں و تمناؤں کا محل آن کی آن میں مسمار ہو کر رہ گیا ...... اس نے چاہا کہ اس خبیث و شیطان صفت کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دے جس نے اس کی دنیا میں آگ لگا

دی تھی۔ میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں سے اُس کی زیست کے چمن کو ویران کر دیا تھا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر پائی ...... وہ انتقام نہ لے سکی۔ فقط اپنی کم بختی پر آنسو بہاتی رہی۔ نم آلود پلکیں لیے وہ گھر واپس آئی ریڈیو چالو تھا اور اس سے قبل کہ وہ بٹن دبا کر بند کر دیتی اس آواز نے اُسے چونکا دیا۔

کہتی ہیں سچ سہیلیاں۔
مرد کا اعتبار کیا!

▼▼

دیوالی کے دیپ

—— رات کے دیوہیکل دیوتا نے اپنے قوی و آہنی مضبوط بازوؤں
کے حلقے میں شام جیسی معصوم جان کو بُری طرح سے دبوچنا شروع کیا
تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں کہیں کہیں اِکا دُکا تارے ٹمٹمانے لگے تھے
.... اور سیاہ و تاریک دبیز پردے پر چاروں اطراف سے آ نیز ان
خوفناک منظر پیش کر رہے تھے .... ہر سو خوف و ہراس سا چھایا تھا۔
ایسا لگتا تھا کہ ساری دُنیا تھک پڑی ہے اور اب چین و سکون کی گود
میں سر رکھ کے آرام کرنے میں مگن ہے ..... فقط کبھی کبھار
کتوں کی بھوں بھوں اس خاموش و دم سکت میں فضا میں ہلچل سی مچا
دیتی تھی .... لیکن ان سب چیزوں کے لوازمے سے الگ سمیتا اپنی جھونپڑی
کے نا فساد برآمدے کی داخلی منڈیر کے ساتھ ٹیک لگائے ہے

بھی حسرت بھری نگاہوں سے ادھر اُدھر تاکنے جھانکنے اور پھر آہ سرد بھرنے میں مشغول تھی۔ سیتا سوچ رہی تھی .... "آج کل کے دن کتنے سوگوار اور المناک ہیں ...... اس کی زندگی کتنی غمگین ہے ...... اس کی دُنیا کتنی اداس اور بے چین ہے"...... اس کے نصیب کس قدر پھوٹے ہوتے ہیں .... آج برابر تین ہفتوں سے اس کا بابا بستر مرگ پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہے۔ دم توڑ رہا ہے اور اس کا اس دُنیا میں سوائے بابا کے کوئی ایک نہ تھا...... جمع شدہ پونجی باپو کی بیماری کا علاج و معالجہ کرانے میں صرف ہو گئی ...... گھر میں کچھ کھانے کو نہ رہا اور پھر کل دیوالی بھی تو ہے۔ کل رات دیپ مالا ہو گی"...... اور ...... اتنا سوچ سیتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ...... اس نے اپنی بے بسی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے منڈلاتے ہوئے نظر آیا۔ نقشے کے منہدم نقوش واضح ہونے لگے ...... فکر و تخیل کا پرندہ دماغی وسعتوں میں پرواز کرنے لگا ...... اور آنکھیں اب غمگین ہو چلی تھیں ...... آنسو کے قطرے پہلے اس کے دامن کو تر کر گئے اور پھر منڈیر کی بالائی ڈنڈی پر اس طرح تسلط جما گئے جیسے خزاں رسیدہ زرد پتوں پر شبنم کے قطرے ...... قطرے پر قطرہ ...... قطرے جمع ہوتے گئے۔ ایک پر ایک ...... وہ تاکنے لگی ...... قطرے یکجا ہوئے ...... اور پھر اس سے ایک تالاب نظر آیا ...... تالاب نے جھیل کی صورت اختیار کر لی ...... سیتا بغور جائزہ لینے لگی ...... جھیل نے ساگر کا روپ دھار لیا ...... اور سیتا کو ماضی کے دلدلوں نے

اپنی دبی زندگی کے زاویے پھر سے اُبھرتے اور اچھلتے نظر آئے ...
... ، سیتا سب کچھ دیکھنے میں کامیاب اُتری —— وہ بھی دن تھے کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھی ۔ اس کے معصوم ہونٹوں کی سطح پر بھی تبسم کی لکیریں تیرا کرتی تھیں اور وہ سماں جبکہ دیوالی کے روز اُس نے رمیش بھیا سے کہا تھا!

" دیکھو بھیا ! باپو فقط میرے لئے پچاس چراغ لے آئے ہیں ۔ ان سے کیا ہوگا ۔ مجھے تو گڈی گڈا والی بیٹھک کو بھی تو دیوں سے سجانا ہے " —— اور پھر رمیش نے الگ سے اُس کے لئے پچاس اور چراغ لائے تھے اور پھر سیتا نے اپنی گڈی اور گڈے کو دیپوں کی روشنی میں نہلایا تھا ..... اُس کے ماں باپ اس کی شرارتوں پر کتنا خوش ہوا کرتے تھے ...... اُس کا باپ محکمہ آبپاشی میں بحیثیت ہیڈ کلرک کے تعینات تھے ..... زندگی مسکراتے ہنستے گذر رہی تھی ۔ لیکن نہ جانے بھگوان کو کیا منظور تھا کہ زمانے نے پلٹا کھایا ۔ انسان انسان کا حریف و انسانیت کا دشمن بن بیٹھا ۔ آدمی اپنی بساط بھول گیا ..... انسانیت کی قدروں کو سر بازار لوٹنا شروع کیا گیا ..... اس خون خرابہ اور مار دھاڑ کی تاب نہ لاکے سیتا کی ماتا جی اس جہاں سے روٹھ کر چلی گئی ۔ پھر واپس نہ آنے کے لئے —— اور پھر سیتا کا بھائی .... واحد بھائی رمیش سیتا کی سہیلی کملا کی عزت بچاتے بچاتے بلیدان کے درجے کو پا گیا .... اُف اُس گھڑی سیتا اور اس کے باپو پر کیا گذری ! کس طرح سے اپنے آبائی وطن

مظفر آباد کو انہوں نے خیر باد کہا .... ماں کی نشانی اور اپنے بھائی کی لاش کو وہیں تنہا چھوڑ کے سینیا اور اس کے باپو قافلے کے ساتھ چلتے بنے .... وہ درد و الم اور مصائب وہ لاتعداد مشکلات سے لبریز لمحات ایک ایک کر کے سینیا کے روبرو رقص کرنے لگے .... خیالات کا سمندر اس کی نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ارتعاش سا چھا گیا۔ ایک کھلبلی رو نما ہوئی ..... آنسوؤں کی روانی نے سمندر میں متلاطم لہروں کو جنم دیا۔ سمندر کی گداز و عمیق گود میں وہ جھانکنے لگی۔

—— اب نہ اُس کا بھائی تھا نہ ماں۔ بلکہ اپنے باپو کے ہمراہ اپنے وطن سے دُور .... بہت دور وہ ایک ایسے علاقے میں قیام پذیر تھے جس سے "پتھروں کے شہر" سے یاد کیا جاتا ہے۔ نئی جگہ آ کے بھی اُنہیں طرح طرح کی مشکلوں اور سختیوں سے مقابلہ کرنا پڑا ...... وہ جانکاہ منظر .... وہ روح فرسا حالات .... سینیا سب کچھ برداشت کرنے لگی! ..... اس کا باپو نواحی ابریشم کارخانے میں مزدور کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اب وہ ہیڈ کلرک کہاں ..... اب لوگ اُس سے بابو جی کہہ کے نہیں پکارتے تھے بلکہ نام لے کر .... اوگو پالے ..... اور بیٹی کے ساتھ پاس ہی ریفوجی کیمپ میں رہائش رکھتے تھے ..... وقت کا پنچھی پرواز کرتا گیا ... دن سفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بیت گئے۔ اب سینیا جوان تھی۔ بھرپور دوشیزہ! اور اس کا باپا کمزور ہونے کے باوجود برابر کارخانے جایا کرتا تھا۔ اُس سے سینیا کی فکر لگی تھی اور اسی فکر میں غلطاں وہ زیادہ سے زیادہ

رقم بچانے کے لئے کارخانے میں رات کو بھی دیر گئے تک کام کیا کرتا تھا
..... آرام اس کی قسمت میں کہاں ۔ جوان بیٹی کا باپ اور آرام
..... دو متضاد چیزیں ٹھہریں ۔ اب انہوں نے ایک چھوٹا سا سرکار
کی جانب سے دئیے گئے زمین کے غیر آباد ٹکڑے پر ندی کے کنارے
کھڑا کر لیا تھا ..... مگر نہ ہونے کے برابر ۔ کیونکہ برسات کے دنوں میں
اس کی حالت ایک تال سے کم نہ لگتی تھی ! ..... سنیتا بڑی ذہین اور
زیرک تھی ۔ اس نے مقامی گاندھی آشرم میں جانا شروع کر دیا ۔ جہاں
بنائی سلائی اور کتائی کا کام عورتوں کو سکھانے کا انتظام مس پنڈاری
لتا نے کر رکھا تھا ..... سنیتا بھی اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگی ..... لیکن
چند ہفتے گذرنے پر ہی مس پنڈاری لتا نے سنیتا کے ابھرتے ہوئے
ارمانوں کو خاک میں ملا کے رکھ دیا ۔ اس کے آگے بڑھتے ہوئے
ارادوں میں آگ لگا دی ! ..... اس کی زندگی کی راہ میں رکاوٹوں
کے پہاڑ کھڑے کر دئیے ۔ ..... مس پنڈاری جتنی حسین تھی اتنا ہی
اس کا من کھوٹ سے بھرا پڑا تھا ..... اس کے دل میں شیطان
کا بسیرا تھا ۔ اس کا علم سنیتا کو جب ہوا کہ دیوالی کے دیپ جلانے
تھے اور اس سے رقم کی زیادہ ضرورت تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ اس
دیوالی پر دھوم دھام سے دیپ مالا کرے ۔ اپنی اس خواہش کو مس
کے نذر کیا کر دیا کہ اس نے رات کو دیر گئے تک کام کرنے کا اس
سے مشورہ دیا ..... اور بھی چند لڑکیاں رات کو کام کر رہی تھیں ۔
..... پھر کافی رات گئے ... پنڈاری لتا نے سنیتا کو بنگل والے

کمرے میں بلایا اور کہا تھا۔

"سیتا کیوں اپنے آپ کی دشمن بن بیٹھی ہو..... اس عمر میں اتنی محنت! یہ دن تو تمہارے عیش اور مزے لوٹنے کے ہیں..... اور ....."

پنڈاری لتا اپنی نیم معمر آواز میں ابھی اتنا ہی کہہ گئی تھیں کہ صحن کی طرف کھل جانے والے دروازے سے ایک دراز قد جوان داخل ہوا .... جس نے نیا سوٹ اور گلے میں پھندا لبطور نزاکت ڈال رکھا تھا۔ آمنا سامنا ہونے پر پنڈاری لتا نے قفل سکوت توڑ دیا۔

"سیتا جاؤ! کنور کے ساتھ چلے جاؤ! تمہیں اپنی قیمت اور قدر کا اندازہ ہوگا"۔

.... سیتا کچھ بھی نہ کہہ سکی .... اور اس دوران کنور صاحب نے سیتا کی جانب اپنا ہاتھ دراز کر دیا .... اب سیتا سے نہ رہا .... بھوکی شیرنی کی طرح بپھر پڑی!

"مس پنڈاری لتا .... خوب! نام گاندھی آشرم اور کام اتنا نیچ .... یہ ہیں وہ زرین اصول جن کے تحت تم باپو گاندھی کے آدرش کی رکھشا کرنا چاہتی ہو!۔ حیران ہوں اس سے۔ آشرم کھول یا مہذب چکلہ ..... لعنت ہے تم پر اور تمہاری زندگی پر .... اس طرح کے عزت لوٹنے والے آشرم ہمارے سماج اور ہمارے دلیش بھارت ورش کے سینے پر رستے ہوئے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے وچار اتنے گرے ہوں گے، مجھے سپنے میں بھی اُمید نہ تھی۔ اس

آشرم میں ہر ایک عورت اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کا پلندہ لے کر آتی ہیں تاکہ ایک اچھے انداز اور عزت کے ساتھ زندگی کے تلخ اور ترش دور کا مقابلہ کر سکیے ..... مگر تم ..... شرافت کے بھیس میں ان کی لاچاریوں اور مجبوریوں سے کھیلنے سے بھی گریز نہیں کرتی ہو۔ اس طرح سے زندگی بنانے کی لگن ہوتی تو واجب جگہ پر جاتی .....
میں نے تمہیں ایک ماں کی طرح چاہا تھا ..... مگر کیا معلوم تھا کہ تم اپنی بیٹی کی عزت و ناموس کا سودا اپنے ہاتھوں سے کرنے میں بھی جھجک سے کام نہ لو گی ......" سیتا اتنا کہہ چکنے کے بعد کمرے سے باہر آئی۔ وہ رو رہی تھی، مگر پنڈاری لتا اور کنور صاحب میں سکت نہ تھی کہ اس سے روکتے یا کچھ کہتے۔ جیسے وہ بے جان پتھر بن پڑے ہوں۔ وہ دونوں دیوار سے چپکے رہے اور سیتا اپنی کٹیا میں جا کر کھاٹ پر لیٹے زار و قطار رونے لگی! جب سے اس نے گاندھی آشرم کا رُخ نہیں کیا۔ اس سے اب رام کی باتیں یاد آنے لگیں ..... اس نے ایک دن کہا تھا۔

"سیتا! یہ دنیا بہت بُری ہے۔ اس دنیا سے نیکی کی امید رکھنا سوکھے کنوئیں میں پانی کی بوند ڈھونڈنے کے برابر ہے ..... یہاں انسان کم اور شیطان زیادہ بسیرا رکھتے ہیں۔ یہ دنیا وقت وقت پر روپ بدلنا جانتی ہے۔"

رام چودھری جی کا بیٹا تھا ..... چودھری نے انقلاب کے دنوں لوٹ مار کے ذریعے کافی اندوختہ جمع کر رکھا تھا اور دوسروں کے

مال و دولت پر قبضہ جمائے آج چودھری بن بیٹھا تھا۔ لوگوں کو سود پر رقم دینا اور ان کی مجبور زندگی کی ہر ادا سے کھیلنا چودھری نے اپنا فرض جان لیا تھا۔ . . . یہ بھی زمانے کا پھیر ہے۔ انقلاب سے پہلے رام کے باپو چودھری نہیں بلکہ ایک نائی کی دکان رکھتے تھے اور اُس سے سب خلیفہ کے نام سے یاد کرتے تھے . . . لیکن انقلاب زمانہ نے جہاں انسانیت کے دیوتا کو زندہ در گور کر دیا وہاں رام کے باپو کو خلیفہ سے چودھری بنا دیا اور سینا کے باپو کو بابو جی سے گوپالے مزدور . . . کیا انقلاب تھا یہ ! . . . رام چودھری جی کا اکلوتا بیٹا تھا . . . اور عادات و اطوار میں اپنے باپ سے بالکل برعکس !! وہ اکثر سینا کے پاس آ کے ہنسی خوشی وقت گذارنے کی بابت سوچتا . . . بن ماں کے لال کی شرافت، انسیت اور مروت پرکھ کے سینا رام سے پریم جتانے لگی . . . ملاقاتیں بڑھتی گئیں . . . وقت گذرتا گیا . . . عہد و پیمان باندھے گئے . . . اور جیون بھر ایک دوسرے کے بن رہنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ رام لبا اوقات سینا کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کو خود پورا کرنے لگا۔ سینا کا باپ خود جو رام اور سینا کا ملاپ چاہتا تھا۔ اس کی چاہ تھی کہ ان دونوں کا پریم پھلے پھولے . . . لیکن یہ نہ ہو سکا۔ . . . چودھری جی نے جب اس بابت ایرے غیرے کی زبان سے سنا تو آگ بگولا ہوئے . . . اس کا چہرہ انتقامی نقوش سے بھر گیا اور پہلے اُس نے رام کو ٹوکا . . . اور پھر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہونے پر رام کو جالندھر اپنے لوہے کے کارخانے کا منیجر بنا کے بھیج

دیا...... رام کو اپنے پتاجی کے سامنے ایک نہ چلی اور چاروناچار دوسرے شہر کا رُخ کرنا پڑا...... سیتا رام سے بچھڑ گئی چودھری جی نے رام اور سیتا کو ایک دوسرے سے جُدا اور الگ کرنے کی ایک کامیاب چال کھیلی...... اور پھر ایک دن سیتا پاس والے باغیچے میں پوجا کے لئے پھول چُننے گئی تھی تو چودھری کی سواری وہاں سے گذری!۔ گاڑی روک کر... سیتا کو پاس بُلا کے کہا تھا۔

"سیتا تم رام کے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ میں اس کی شادی سیٹھ کروڑی مل کی بیٹی آشا سے کر لی طے کر گیا ہوں۔ تم اپنی حیثیت کا اندازہ کیوں نہیں کرتی ہو"

سیتا جواب میں چُپ رہی اور اس کی آنکھوں میں جل کے قطرے تیرنے لگے۔

رو مت! کیا تم رام کا خیال کسی قیمت پر بھی دل سے نہیں نکال سکتی!!

"نہیں"۔ یہ سیتا کا جواب تھا جو اُس نے بلجہ مستقل دے دیا۔

دیکھو سیتا! رام تمہارا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ آشا کو چاہتا ہے اور اب بھی اُسی کے پاس رہنے کو گیا ہوا ہے...... تم نے اُس سے بہت کا نا شروع کیا تھا۔ مگر وہ اب راستے پر آیا ہے۔ وہ تمہیں نہیں بلکہ آشا کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ کیوں اپنی زندگی کو روگ لگانا چاہتی ہو"...... اور پھر قدرے توقف کے بعد چودھری بولا تھا۔

سیتا۔ دیکھو...... میری جانب دیکھو!.... رام میں کیا

دھرا ہے۔ مجھے اور میری زندگی کو بھی ایک ساتھی کی ضرورت ہے
..... دیکھو! مجھ میں کون سی کمی ہے۔ تم میری مدد کر سکو تو میں
تمہیں رانی کے سمان رکھوں گا۔ عیش کروگی اور راج کرنا نصیب
ہوگا... کتنی خوش قسمت ہو تم جو میرے دل نے تمہیں اس گہرے
انداز میں چاہا اور پیار کیا..... یہ کہہ کے چودھری نے جب اپنا
ہاتھ سِتیا کے جسم سے مس کرنے کی غرض سے دراز کر دیا تو سِتیا
بِنا کچھ سوچے برس پڑی!

"کمینے! دغا باز! لیٹرے.... تمہاری یہ مجال..... میں تمہارے
لئے بیٹی کے ہمسر ہوں... تمہیں لاج نہ آئی! تمہاری یہ پلید زبان
ایسے الفاظ کہنے سے قبل جل کیوں نہ گئی!..... دور ہو جاؤ! میری
نظروں".....

بیٹی سِتیا..... بیٹا سِتیا..... سپنے ٹوٹ گئے....
سمندر میں ارتعاش سما گیا اور جھیل میں تبدیل ہوا.... آہستہ آہستہ
جھیل تالاب کا روپ دھار گیا۔ تالاب قطروں کا انبار.... اب
منڈیر کی چاکور ڈنڈی تک بکھری سطح پر جل کے قطرے تھے۔ گیلے چمکیلے
.... خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بھیگی پلکوں کو اپنے نیم تر دامن سے
خشک کئے سِتیا بابا کی کھاٹ کی طرف چل پڑی۔

"کیا چاہیئے بابو!" سِتیا کی آواز بھرا گئی!

"بیٹی تم ابھی تک سوئی نہیں ہو.... ساری رات آنکھوں آنکھوں
میں کاٹ دی! آج تو مجھے آرام تھا۔ بیٹی پانی پلا نہ دے!"

سیتیا نے باپو کے خشک و زرد سے حلق پر پانی کے قطرے ٹپکا دیئے اور بابا کہنے لگا۔

"بیٹی مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے لئے کچھ بھی نہ کر سکا.... میں نے تمہیں صرف تکلیف سے نوازا۔"

"باپو" - یہ کہتے سیتیا نے اپنا معصوم ہاتھ بابا کے منہ پر چسپاں کر دیا اور رو دی۔

"یہ مت کہیئے باپو جی! آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا یہ کوئی میرے دل سے آ کر پوچھے۔ آپ نے ایک بن ماں بچی کو ایک باپ کے ساتھ ساتھ ایک ماں کی طرح بھی پالا۔ یہ کیا کم ہے۔"

"بیٹی" باپ کی آواز میں شکستگی سما گئی!.... چاہتا تھا اور دل کی آشا تھی کہ تمہیں کسی کے سپرد کر دوں۔ تیرا بیاہ رچاؤں.... لیکن کیا کروں بیٹی.... میں تمہیں رام سے بھی سیتیا نہ ملا سکا۔ کتنا بد نصیب ہوں میں.... میں تیرے ہاتھ بھی پیلے نہ کر سکا۔

پو پھوٹنے کو تھی.... سیاہ پردے ہلکے اور پھیکے پڑ گئے! مشرق کا حصہ گگن کا سرخ چادر اوڑھے طباق جلا کر استقبال کرنے کو آمادہ ہوا.... سیتیا بابا کی کھاٹ کے پاس چٹائی پہ بیٹھے سوچنے لگی.... آج دیوالی ہے۔ دیوالی.... رات کو دیپ مالا ہوگی! دیوالی کا خیال زندہ ہوتے ہی اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ دیپ مالا کی بڑی دلدادہ اور رسیا تھی۔ ہر سال کسی نہ کسی طرح اس نے چراغوں کی محفل کو سجانا جان سے عزیز جان لیا تھا۔ لیکن آج

کیا ہوا جبکہ کھانے کو گھر میں کچھ نہیں پڑا ہے۔ سارا اندوختہ بالپو کی بیماری میں صرف ہوا تھا۔۔۔۔ بالپو نے ستیا کی حالت پرکھ لی اور اس کی نیم تر آنکھوں میں جھانکے اس نے ستیا کے دل میں پوشیدہ راز کو جان لیا۔۔۔۔ اس کے ذہن میں طوفان سا اٹھا۔۔۔۔ اس سے وہ الفت ستانے لگی جو اس کی نورِ نظر کو دیپ مالا کے ساتھ تھی!۔۔۔ وہ بچپن سے اس دیوالی کا استقبال ایک اچھے زاویے سے کیا کرتی تھی۔۔۔۔ اور پھر اپنی بدحالی کا خیال دماغ میں رینگنے اس سے بُری طرح ستانے لگا۔۔۔۔ غم گزیدہ اور ستم رسیدہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف جھانکے۔ اس نے کہنا شروع کر دیا۔

"ستیا! رات کو دیپ مالا کرنے کے لیے چراغ اور تیل نہیں نا جو تم غمگین اور اداس بیٹھی ہو۔۔۔۔ افسوس میں نے تمہاری زندگی کو کیس کیس طرح سے روگ لگا دیا۔۔۔۔ بیٹی غم نہ کرو۔۔۔۔ دیپ مالا ہوگی۔ اور تم نئی چوڑیاں پہن کر نئے جوڑے میں ملبوس اپنے دل کی حسرت پوری کرو گی۔۔۔۔ ستیا میں کارخانے میں جا کے گئے ماہ کے بارہ دنوں کی محنت کا پھل لانے جاؤں گا۔۔۔۔ ان سابقہ ایام کی تنخواہ پائے چراغاں ہوگا۔ تمہارے من کی مراد پوری ہوگی!۔ میں بیٹی جاؤں گا۔ میری چھڑی اور پگڑی لا کے دے بیٹی۔"

"نہیں بابا! آپ اس حالت میں نہیں جا سکیں گے! اتنے دنوں کا فاقہ اور پھر کمزوری!۔ نہیں بالپو۔۔۔۔ بابا نے اٹھنے کی کوشش بمشکل کی لیکن ابھی پوری طور سے استادہ نہ ہوئے تھے کہ چت گر

پڑے۔ ضعیفی حد سے آگے بڑھ گئی تھی اسیتا نے بابا کو پھر سے کھاٹ پر سلا دیا اور اس کے سوکھے حلق پر پھر سے جل کے قطرے ٹپکا دئے ....
چادر سنبھالے وہ پاس والی جھروکے کے دونوں پٹ کھولے بستی کا نظارہ کرنے لگی۔ وہ دور دور تک پھیلے ہوئے سرسبز پہاڑوں کو گھورنے لگی اور پھر آسمان کی جانب جس کی وسعتوں میں سورج دیوتا چمک دمک رہا تھا۔
..... وہ سوچنے لگی.... کیوں نہ کارخانہ میں جاکے وہ خود بابا کی رقم وصول کرلے۔ اور پھر اُس محنتانہ سے کم از کم دیوالی کے احکامات پورے کرتے..... دیپ مالا ہوگی!... اور پھر ہری کا رلشمی کانچ کی چوڑیاں پہنے وہ جلتے دیپوں کی لو تیز کئے انہیں بجھنے نہ دے گی......!
سیتا ہزاروں ارمان دل میں لئے کارخانے کی جانب بڑھی! اب تو سورج سر پر کھڑا تھا..... سنتری نے ترش انداز میں پہلے سیتا سے پوچھ پاچھ شروع کردی! اور پھر اُس سے مینجر کے کمرے تک ساتھ دیا.... سیتا کو معلوم ہوا کہ آج کے دن مزدور اپنی مزدوری حاصل کرنے کو ہی آئے ہیں ورنہ کارخانہ بند پڑا ہے ...... مینجر کے کمرے میں ایک نیم معمر دنیم جوان شخص گاندھی ٹوپی پہنے بیٹھا تھا.... جو مینجر تھا۔
"نمستے" یہ سیتا کی آواز تھی۔
"جے ہند"۔ اتنا کہنے پر مینجر نے آنکھیں سامنے پڑی فائیل سے ہٹا کر اوپر کو اٹھادیں اور سیتا پر جمادیں۔ وہ سراپا اُس کا جائزہ لینے لگا.....
اور پھر اپنے بدشکل ہونٹوں کی کھردری سطح پر زبان پھیر کے اور پنسل کی نوک دائیں کان میں ٹھونستے چپراسی سے کہنے لگا۔ "ڈیپٹی جی کو بغل

والے کمرے میں لے جاؤ۔ وہاں انتظار کرے۔"

"سنیتا چپراسی کے اشارے پر ملحق کمرے میں انتظار کرنے لگی۔

.... وہ انتظار کرتی گئی .... گھنٹے بیت گئے .... کئی گھنٹے بیت گئے اور پھر شام کے حلقے نمودار ہونے لگے۔ سنیتا سہم سی گئی اور چپراسی سے منیجر کی بابت دریافت کرنے لگی۔ چپراسی نے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ گاندھی ٹوپی میں ملبوس منیجر صاحب تشریف لائے اور ادھر اُدھر جھانکنے۔ سنیتا کے پاس ہی پڑی آرام کرسی پر تسلط جما گئے۔ سنیتا تعظیم کے لیے اُٹھی اور منیجر سے کہنے لگی۔

"میرے بابا گوپال رام اس کارخانے میں ملازمت کرتے ہیں.... کئی ہفتوں سے بیمار پڑ جانے کے سبب کارخانہ بھی نہ آسکے.... اُن کے کہنے کے مطابق بارہ دنوں کی تنخواہ قابل ادا پڑی ہے۔ میں اُس رقم کو لینے کے لیے اس وقت آئی ہوں.... رقم دے کر ہماری مدد اس وقت کیجیے۔ بابو میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"میں تو گوپال کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اُس کی بیٹی ہو۔ بڑے ایماندار آدمی ہیں وہ۔ بھگوان اُنہیں شفا عطا کرے.... مگر اس پاگل نے کبھی تمہارا ذکر نہ کیا.... اور ہاں تمہارا نام کیا ہے؟"

"سنیتا"

"واہ! کیا نام پایا ہے۔ مجھے راد نندا کہتے ہیں.... میں ابھی تمہارے بابو کی رقم لے کے حاضر ہوا۔ تم اتنی دیر تشریف رکھیے! یہ کہہ کے راو صاحب اٹھے اور ملحق والے کمرے کا دروازہ کھولے

اندر چلا گیا......

— سینا سوچنے لگی۔ تانے بانے بنتے رہی۔ دیوالی کے دیپ اس کے تصورات کی لڑی پر جگمگانے اور اس کے پژمردہ چہرے پر پھر سے بشاشت کھیلنے دوڑنے لگی...... اتنے میں منیجر صاحب داخل ہوئے۔ ایک انداز دگر ہیں...... اُس کے سیدھے ہاتھ میں بوتل تھی۔ جس کا کاگ اُٹھ چکا تھا اور بوتل نصف سے زیادہ خالی ہو پڑی تھی!...... منیجر کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ اُس کی حالت ایک وحشی سے کم نہ تھی...... خونخوار آنکھوں سے وہ سینتا جیسے پونر جسم کو گھورنے لگا...... تاکنے لگا......
اُس نے بوتل کے سرے کو پھر منہ سے لگا لیا۔ قدم اور بھی ڈگمگانے لگے...... اور چپراسی کو اشارہ کئے دونوں دروازے بند ہو پڑے...... سینتا خوف دہراس سے تھرا اٹھی۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل پڑی! اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ اُس کی دُنیا اُس کی نظروں کے سامنے تاریک ہو پڑی! اُس سے کچھ بھی نہ سُوجھائی دیا کہ کیا کس طرح سے کریں......
اتنے میں حیوان نما منش لڑکھڑاتا ہوا اُس کی جانب بڑھا...... اُس کے حواس پر سر در سا سوار تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک انسان ہے اور کسی کا پتی، کسی کا بھائی اور کسی کا باپ ہے...... وہ سب کچھ فراموش کئے سینتا کی طرف بڑھنے لگا اور سینتا اپنی عزت و ناموس کی رکھشا کی خاطر پیچھے کو ہٹتی تھی۔ "سینتا بھاگتی

کیوں ہو...... مجھ سے بھاگنا آسان نہیں ہے.. میں تیرا راون ہوں۔ ہاں میں سیتا تیرا راون ہوں۔ میری قید سے تمہیں کوئی نہیں چھڑا سکے گا...... کوئی نہیں...... سیتا..... تمہیں رتم..... چاہیے نا ـــ میں دے دوں... گا ـــ ایک بڑی..... رتم ـــ مجھ..... سے.... کترا ؤ..... نہیں تیری مدد..... کرنا..... چاہتا ہوں ـــ آؤ..... میری بانہوں میں..... آ کے..... آپ میری تشنگی..... کی آگ.... بجھا دو ـــ آؤ..... تڑپاؤ..... کہنے سے..... کچھ بھی..... حاصل نہ ہو گا ـــ"

"اتنا کچھ سننے پر سیتا کی زبان کام کر گئی ـــ "کمینے.. جلاد.... بھگوان کی مار تم پر! "تم گاندھی ٹوپی پہن کر بھی اس طرح عورت کی مجبوری سے کھیلنا اپنا دھرم جانتے ہو۔ مجھے خواب میں بھی اُمید نہ تھی اِ ـــ تم اتنے نیچ، بدکردار اور بدخصلت ہوں گے، مجھے علم نہ تھا ـــ کم عقل، تم راون بن کر میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا جب کہ میرا رام میرے پاس ہے۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے۔ وہ تم جیسے خونی بھیڑیے سے انتقام لینا اچھی طرح جانتے ہیں ـــ میری طرف گھورنے سے پہلے تمہاری آنکھیں پتھرا کیوں نہ گئیں..... ـــ" اتنا کہتے ہی سیتا بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ مگر راون کا چیلا ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور سیتا کی طرف برابر بڑھتا گیا..... اتنے میں سیتا نے آنسو پونچھ ڈالے

..... اُس کے تن بدن میں ایک حرکت سی سما گئی ..... اور وہ اس بے حواس حیوان کو ٹھکانے لگانے کے منصوبے باندھنے لگی! ــــ اُس کی رگ رگ میں انتقام کی لہریں نہ جانے کیوں کر جاگنے لگیں! ــــ مینیجر صاحب بوتل کو خالی کر گیا تھا اور بوتل کو فرش پر لٹکائے وہ سینیا کو اپنی باہوں کے حلقے میں جکڑنے کے لئے آگے کو بڑھا ..... سینیا اپنے کو اس ذلیل اور قزاق کے ہاتھوں کیسے تباہ ہونے دیتی ..... جھٹ فرش پہ پڑی خالی بوتل کو ہاتھوں میں لئے اُس نے ایک بھرپور وار کیا ..... مینیجر صاحب کی بے حواس کھوپڑی زخمی ہو گئی اور وہ دھڑام سے فرش بوس ہوا اور سینیا ایک فاتح کی طرح کھڑکی کے ذریعے کارخانے سے باہر آگئی ..... اُس کی آنکھوں میں فاتحانہ جھلک سی تھی ..... سینیا نے بستی میں قدم رکھا تو ہر سو دیوالی کے دیپ آب و تاب کے ساتھ جل رہے تھے۔ ساری بستی چراغوں کی روشنی میں نہلا رہی تھیں ..... ایک حسن سا نکھرا ..... بستی کے اس سرے سے اس سرے تک دیپوں کی قطاریں جگ مگ جگ مگ کرتی اماوس کی رات کو شرما رہی تھیں ..... اتنے میں سینیا کو اپنی جھونپڑی کا خیال آیا ..... وہ بے نور ہوگی! اس میں چراغاں نہ ہوگا ..... کتنا ..... تاریک ..... کتنا اس بستی کے ماتھے پر سیاہ دھبہ لگتی ہوگی، وہ تھرا اٹھی، بے چین ہوئے وہ تیز تیز قدم بڑھانے لگی! ..... اتنے میں اُس کی کٹیا سامنے دکھائی دی! .....

بقعۂ نور بنی ہوئی ...... کٹیا سراپا چراغوں کی روشنی سے لدی پڑی تھی اور ایک دلفریب منظر پیش کر رہی تھی ...... وہ سوچنے لگی یہ سب کیسے ہوا ...... وہ دوڑی۔ دروازے پر اُس سے بابا ملے اور اس کے پاس رام چراغوں کی بتی کا جلا ہوا سرا کلتے روشنی تیز کرنے میں محو تھے ...... سیتا کو دیکھ بابا کی آنکھیں کھل گئیں ...... اور سیتا اس کے سینے سے ساتھ چمٹ پڑی ! اور رونے لگی ...... زار و قطار ...... رام سے نہ رہا گیا اور کہا۔

"سیتا ! مجھے معاف کر دے۔ میں اب تمہیں اکیلے میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تمہیں اپنے ساتھ لوں گا۔ سیتا تجھے اب رام سے کوئی جُدا نہ کر سکے گا ...... اور یہ دیکھو دیپ مالا کس طرح ہو رہی ہے۔ سیتا میں جانتا تھا کہ تمہیں دیوالی کے دیپوں سے دلی الفت ہے۔ اس خاطر میں آیا ......"

سیتا بابا کو کھاٹ پر لٹاتے رام سے بغل گیر ہو گئی نہ چھٹنے کے لئے۔ اور دیوالی کے دیپ اُنہیں آشیرباد دے رہے تھے ——۔

ٹوٹی کہاں کمند

نمائش گاہ کا گوشہ گوشہ رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بقعۂ نور لگ رہا تھا۔ آکاش پر کہیں کہیں بادلوں کا سلیٹی چہرے روشن ستارے ان قمقموں کی چمک دمک سے متاثر ہو کے ندامت کے پردوں میں غرق فقط ٹمٹما رہے تھے۔ انور نے ٹکٹ حاصل کرنے کی غرض سے کاؤنٹر کی جانب اپنا ہاتھ کیا بڑھا دیا کہ نازک انگلیوں کی لمس نے اسے غیر ارادی طور چونکا دیا . . . ایک سنگ اندام وچھریری بدن والی حسینہ کو اپنے قریب پاکر وہ منٹ بھر کے لئے اچنبے میں پڑ گیا۔ دفعتاً بلا سوچے اس کی زبان کام کر گئی۔

”آیئے میں ٹکٹ نکالے دیتا ہوں!“

"اونہہ ..... نہیں ..... میں ..."

"کوئی مضائقہ نہیں" انور بات کاٹتے کہہ گیا۔ "اس خاصی بھیڑ میں آپ کا ٹکٹ حاصل کرنا کوئی سہل بات نہیں ہے۔ میں نکالے دیتا ہوں"۔ جواب میں ایک بند مٹھی انور کی جانب بڑھ گئی اور اُس کے خالی ہاتھ میں کھل گئی۔

"چار ٹکٹوں کے پیسے ہیں!"

چار ٹکٹیں ..... انور پیسوں کو اوک میں چھپائے بازو آگے بڑھا گیا۔ ٹکٹیں حاصل کرنے پر اُسے معلوم ہوا کہ اس دوشیزہ کے ساتھ اور بھی تین لڑکیاں ہیں۔ مذکورہ بالا لڑکی نے ٹکٹیں لے کر انور کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی ہمجولیوں نے بھی باری باری وہی نہج اپنائی۔ لیکن اُن میں سے ایک نے لفظ "شکریہ" کچھ اس ادا کے ساتھ زبان پہ لایا کہ انور کے رُوم رُوم میں بشاشت کی لہر دوڑنے لگی۔ وہ کیف و طرب کا مخلوط مجسمہ بنے اس حسین اتفاق پہ دل ہی دل میں ہنسنے لگا ——— ویسے سنجیدہ پن انور میں کوٹ کوٹ کر بھرا پڑا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرنے میں بے حد شرما جاتا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر انور اس لڑکی کو دیکھنے اور گھورنے میں یوں مصروف رہا جیسے ان کی بہت دیرینہ جان پہچان ہو۔ جواباً وہ حسن و جوانی کی مورتی بھی بار بار اپنی سہیلیوں سے نظریں بچائے پلٹ پلٹ کر دزدیدہ نگاہوں سے انور کو دیکھنے لگی ..... جس سبب انور

کی چاہ کو اور بھی شہہ مل گئی۔

نمائش سے وابستہ ہر نوع کی دل چسپی و زیبائش سے لُطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ گاہ بہ گاہ ایک دوسرے کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ چھا نکتے کہ کسی دوسرے کو شبہ نہ ہوتا... ... موت کا کنواں۔ بجلی کا کرشمہ۔ للو کے پیٹ میں کلوا۔ بن ہاتھوں کے کام کرنے والی مسر دڑا۔ کالا جادو۔ زندہ ناچ و گانا...... ایسے ہی کچھ شعبدے تھے جن کو ایک ایک کر کے سرسری طور انہوں نے جائزہ لیا۔ اور انور خود اپنے آپ سے بے نیاز قریباً اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا... کیوں کہ وہ التفات و اپنیت سے بھرپور نظریں اُس کو کسی بھی طرح اپنے سے الگ ہونے نہیں دیتی تھیں.... ایک کشش سی تھی جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیے ہوئے تھی۔

انور ٹھٹھک کر رہ گیا جبکہ ساتھ والی لیست قد لڑکی نے اُس دوشیزہ کو نام سے پکارا.... جب موت کے کنوئیں کی دلچسپیوں سے قطع تعلق وہ انور کے چہرے پر نظریں مرکوز کر گئیں تھیں!

عذرا! کتنا دل کش اور خوبصورت نام تھا۔ کتنی مٹھاس تھی اس نام میں.... انور نے بار بار اس نام کو دل ہی دل میں دُھرانا شروع کیا....

سڈول جسم.... اعتدال پسندانہ قد۔ معصوم ادا.... اور اُبھرے ہوئے خدوخال۔ اُسی کی دل کشی کو اور بھی بڑھا گئے تھے۔

لٹوں میں سفید بال اور دونوں گچھے شانوں پر ڈالے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی سپیرن دو لمبے لمبے کالے ناگوں کو گلے کا ہار بنائے پھر رہی ہو۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں میں بلا کی سی کشش تھی۔ غضب کا لوچ تھا۔

خلاف توقع انور اس حسین و جمیل دوشیزہ کی نسبت زیادہ سے زیادہ سوچنے لگا اور اُسے من ہی من میں چاہنے لگا۔ آج زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اُسے اپنی طرف یوں بُری طرح مرعوب کر دیا۔ آج تک گو اُس نے ہزارہا لڑکیوں کو دیکھا ... اُن سے باتیں بھی کی تھیں۔ لیکن عذرا پہلی لڑکی تھی جس میں وہ حد سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔

نمائش گاہ میں ہزاروں مرد، عورتیں۔ بچے جوان اور بوڑھے اپنی دھن میں مست چیزیں خریدنے اور کھیل تماشے دیکھنے میں مشغول تھے۔ ایک انور ہی تھا جو ان سب لوازمات اور دلچسپیوں سے کنارا کئے صرف عذرا کی بابت سوچنے لگا ... سوچتے سوچتے وہ بہت دور چلا گیا .... خیالات کے دھارے سونے کی طرح اُس کے خالی ذہن میں اُبھر پڑے۔

"... اب اُسے رابطہ کیسے قائم ہو؟"

... کیا میں اُسے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو سکتا ہوں؟

... کہیں اُسے میرا یہ اسلوب بُرا نہ لگے؟

... کیسے میں چاہ کے پلندہ کی عقدہ کشائی اُس کے سامنے کروں؟

.... آیا اُس کا میری جانب گھور گھور کر دیکھنا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔؟

.... اب پھر سے ہماری ملاقات ہوگی بھی یا نہیں؟

کچھ ایسے ہی خیالات تھے جن کو دماغی وسعتوں میں بسائے انور آگے بڑھ گیا۔ اُس کے لئے نمائش گاہ کی بسیط گود میں اگر کوئی دیکھنے، سمجھنے یا جاننے کی شے یا ہستی تھی تو وہ یہی عذرا تھی۔ اُس کی ایک ایک حرکت کا انور بغور جائزہ لینے لگا۔

— دُکانداروں نے طرح طرح کے ساز و سامان سے اپنی اپنی دکانوں کو دلہن کی طرح سجایا تھا اور پھر محکمہ جنگلات سے متعلق شعبے کو دیکھنے پر عذرا مع ہمجولیوں کے بینڈ سٹینڈ کے عقب میں پڑے ہوئے بنچ پر تسلط جما گئی۔ لاوڈ اسپیکر پر فلمی گانے بج رہے تھے.... ایک عجیب سا سماں تھا.... اس پر آشوب منظر کاری میں سے عذرا کا چہرہ تاباں ایسا چمک رہا تھا جیسے آکاش پر ثریا۔ .... اس کے رُخ زیبا کے چہرے پر ایک غیر معمولی جاذبیت تھی جو ایک چھوٹے سے سیاہ تل نے اور بھی بڑھا دی تھی۔

دفعتاً انور کی زبان کا قفل وا ہوا۔

— نکھرے ہوئے چہرے پہ اک خال سیاہ تاب
رکھا ہے کہاں صانع قدرت نے نگینہ!

اگر عذرا نے کسی ایک شعبے میں دل چسپی دکھائی وہ نمائش گاہ کا وہ حصہ تھا جہاں گھریلو دستکاری کی چیزیں رکھی گئیں تھیں.... اپنے

ملک میں تیار شدہ چیزوں کی نمائش کی گئی تھی۔ وہ ڈیوٹی پر تعین اہلکاروں سے اِس اُس باب استفسار کرنے لگی! اُس نے خود بھی کھدر کا ایک معمولی سالمبا کرتا پہن رکھا تھا!

یہ خصائیل دیکھے انور اور زیادہ عذرا کی جانب جھک سا گیا۔

وہ خود اس معاملے میں ترقی پسند تھا اور اپنے دلیش میں تیار شدہ چیزوں کو استعمال میں لانا اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ انور کا دل خوشی کے مارے اُچھل پڑا جبکہ عذرا کونے میں براجمان بڑھیا کے قریب بیٹھ خود چرکھا کاتنے لگی۔

—— اب کافی دیر ہو گئی تھی۔ قمقمے ایک ایک کر کے گل ہوتے لگے تھے۔ نیل گگن کو بھی ملے جلے کالے و سفید بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا...... اور چند وقفوں کی توقف کے بعد بوندا باندی شروع ہو گئی.... اس پتھروں کے شہر میں پل بھر میں موسم کا رنگ بدلنا کوئی بڑی بات نہیں.... دیکھتے ہی دیکھتے نمائش گاہ سے لوگ نکل کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ عذرا بھی اپنی ہمجولیوں کے ہمراہ نمائش گاہ سے باہر نکل آئی۔ گو انور اس بار اس کی جائے رہائش کی نسبت نہ جان سکا۔ لیکن پھر بھی اُس بستی کی بابت علمیت ہو گئی جہاں عذرا قیام پذیر تھی۔ انور میں خود داری اور خود اعتمادی کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے عذرا کی بستی کے چکر نہیں کاٹے۔

اس واقعہ کے لگ بھگ ایک ماہ بعد انور کو اپنی امی جان کے

پاس جانا پڑا جو ڈوڈہ میں بحیثیت ہیڈ مسٹرس کے تعینات تھی — صبح
سویرے گاڑی میں گھس کر نظریں کیا دوڑائیں کہ ہکا بکا رہ گیا۔ عذرا
ایک نیم معمر خاتون کے ہمراہ اُسی گاڑی میں درمیان والی سیٹ پر
براجمان تھی۔ انور بغیر سوچے اُن کے عقب میں پڑی خالی سیٹ پر
نوجوان کے بغل میں قبضہ جما گیا..... تھوڑے وقفے کے بعد عذرا
اور انور کی نگاہیں ملیں۔ اور آنکھوں آنکھوں میں ہی ایک دوسرے
کو سلام و پیام دینے لگے۔ انور نے ثانیہ بھر کے لئے بھی اپنی دیدوں
کو اِدھر اُدھر نہ ہٹایا۔ وہ بس اُسے دیکھنا چاہتا تھا.....

"بیٹی پیاس محسوس ہو رہی ہے! جاؤ تھوڑے سے سنگترے خرید
کے لاؤ!"

انور بات سنتے ہی ہینڈ بیگ سے لفافہ نکال کر ان کی جانب بڑھاتے
غیر ارادی طور کہہ گیا۔

"لیجیئے۔ میں سنگترے لایا ہوں۔ انہیں کام میں لائیے۔"

بوڑھی ماں نے انور کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ جس کے سوز و
گداز میں اپنائیت و ہمدردی کے نقوش بکھرے پڑے تھے اور
معذرت چاہی۔ لیکن انور ماننے والوں میں سے کہاں تھے..... بے حد
اصرار کرنے پر تھیلا خاتون کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ بس اسٹارٹ
ہو گئی اور ہچکولے کھانے لگی..... اتنے میں آگے کی سیٹ پر بیٹھے
ایک لمبے آدمی نے سگریٹ کا ایک بھرپور کش کیا لیا کہ خاتون نے برقعہ
کا جھروکا کھول کر اُسے ٹوکنا شروع کیا۔ انور نے بھی خاتون کا ساتھ

دیا۔ لمحہ بھر کے بعد لمبے آدمی نے چار و ناچار ادھ جلا سگریٹ بُجھا دیا۔۔۔ اور گاڑی میں سگریٹ کے مرغولے منڈلانے بند ہو گئے۔۔۔۔ راستے میں سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ باتوں باتوں میں انور جان گیا کہ عذرا اپنی ماں کے ساتھ بھدرواہ جا رہی ہے۔ جہاں اُن کے پتاجی مقامی کالج میں ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ انور نے اپنی نسبت باتیں ماں جی سے کھُل کے بتا دیں۔۔۔ اور پھر انور نے اپنائیت کا بھرپور لہجہ اپنائے عذرا کی ماں کو بھدرواہ سے واپسی پر اُن کے گھر آنے کی دعوت دی جو انہوں نے بہ رضا و رغبت قبول کر لی۔

ادھم پور سے گذر کر گاڑی بٹوت میں جا کے رُکی۔ یہاں دن کا کھانا کھانے کے لئے وقفہ دیا گیا۔ ایک ایک کر کے سواریاں اترنے لگیں۔ انور سیٹ سے اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگا کہ آواز نے کانوں کے پردے ہلا دئے۔

"بیٹے! ہم روٹی گھر سے بنا کر لائے ہیں۔ تم بھی کھا لینا۔"

ماں جی کی آواز میں ہمدردانہ جھلک نمایاں طور سے ہویدہ تھی۔

"میں پاس ہی ہوٹل سے کھا کے آتا ہوں۔۔۔ آپ زحمت نہ اٹھائیں"۔

اب کر ماں نے کافی اصرار کیا۔۔۔ لیکن انور نے ایک اور تیر ترکش سے نکال باہر کر دیا۔

"پیٹ میں بھاری پن محسوس کر رہا ہوں۔ اس لئے چائے کے ایک کپ پر ہی اکتفا کروں گا۔"

انور گاڑی سے باہر آنے ہی والا تھا کہ عذرا بول اُٹھی۔

"یہاں رفع حاجت کے لئے مناسب جگہ ہے" - انور جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ماں جی نے لقمہ دے دیا۔

"بیٹا عذرا کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ! پر ہاں واپس آنے میں دیر نہ لگانا"۔

پہلا موقع تھا کہ انور عذرا کے ساتھ اکیلے ہی دوش بدوش بل کھاتی پگڈنڈی پر جا رہا تھا ... دور دور تک چیل اور دیودار کے درختوں سے بھرپور گھاٹیاں خوشنما منظر پیش کر رہی تھیں۔ سرد سرد ہوا کے جھونکے کبھی کبھار ایسا انداز اختیار کر لیتے کہ عذرا کے ڈوپٹے کا سرا سر سے سرک کر شانوں پر آجاتا......

انور بہت خوش تھا۔ اس کے جسم میں بشاشت ایک نرالے طور سے جاگزیں ہونے لگی تھی...... جیسے اُسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ اس بار بھی عذرا سادگی کا نمونہ جان پڑتی تھی۔ اگر اس کے شریر پر کوئی قیمتی شئے تھی تو وہ تھے بُندے جو غالباً سونے کے جان پڑتے تھے۔

"بابا! ایک پیسہ! بھگوان سکھی رکھے"۔ یہ ایک ہٹے کٹے نوجوان کی آواز تھی۔ جس نے معصومیت کا لبادہ اوڑھے اپنا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

اس کی آواز کو ان سنا کر کے وہ دونوں ڈاک بنگلہ کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر چل دئے۔

"بیٹی سدا سہاگن رہو۔ تم دونوں کی جوڑی سلامت رہے۔ انچھر

دکھیاری کو خدا کے نام پر کچھ دے دو بیٹی۔

یہ فریاد سن کر انور کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ عذرا کا خود برا حال تھا اور وہ پسینے سے شرابور کنکھیوں سے انور کو دیکھنے لگی۔۔۔ وہ دونوں آگے بڑھنے ہی والے تھے کہ ضعیفہ درد بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"بیٹی مالک چاند سا بیٹا تم دونوں کو عطا کرے۔ کچھ دیتی جاؤ!"

یہ سننا تھا کہ دونوں کی حالت غیر سی ہو گئی۔ ہوش و حواس فیل بے زنجیر کی طرح ساتھ چھوڑنے لگے۔ انور پر وارفتگی سی چھانے لگی۔ وہ چور نظروں سے عذرا کی حالت کا جائزہ لینے لگا۔ جو غیظ و غضب کی ملی جلی تصویر بن گئی تھی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔۔۔ سرخ انگارہ کی طرح۔۔۔ جیسے ساری رگوں میں سے دوڑتا ہوا خون یکجا ہو کر اس کے چہرے کی گدازیوں میں بسیرا کر گیا ہو۔ یہ دونوں اسی اضطرابی خلش میں غلطاں ایک دوسرے کے لئے معمہ بنے کھڑے تھے کہ ضعیفہ کی قوت گویائی پھر سے بازی لے گئی۔

"بیٹا تم ہی کچھ دے دو! اللہ تمہاری اُمیدیں بھر لائے۔ بیٹا مجھ دکھیاری کی کچھ مدد کرو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔"

انور کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اس کا ہاتھ کوٹ کے سیدھے جیب میں چلا گیا اور ایک بند مٹھی بڑھیا کی جست دراز کر دی۔ عذرا نے ہاتھ روکا۔

"آپ رہنے دیجئے۔ بھکارن کا سوال مجھ سے ہے۔ میں اس کے کسی کام آ سکوں۔ تو مجھے سکون حاصل ہو گا۔"

"لیکن سوال تھوڑا ہی ہم دونوں کے لئے تھا۔" انور برجستہ انداز میں بولا۔

"وہ تو کسی جوڑی کے لئے تھا۔ جو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے بن چکے ہوں۔ اور یہ چاہت ہو کہ ان کی نگری میں ایک مہمان معصومیت کا لبادہ اوڑھے وارد ہو...... البتہ موخرالذکر سوال براہ راست مجھ سے تھا۔ اس لئے میں اسے خیرات میں کچھ دے رہا ہوں۔"

عذرا کا چہرہ لجاجت سے بھر گیا۔ اس کی پھیلی پھیلی پیشانی پہ شرم و حیا کی ہلکی ہلکی دھاریں نمودار ہو گئیں...... ڈوپٹے کے کنارے کو سر کے آگے کیا سرکایا کہ ساری کی ساری شرم یکسر پھوٹ پڑی اور انور کے بعد وہ بھی بڑھیا کے کشکول میں کچھ ڈال گئی۔

"نہ جانے یہ افلاس ملک سے کب دور ہو گی۔" عذرا نے لجاجت کے پردوں کو چہرے پر موضوع سخن بدلنے کی کوشش کی۔

"جب انسان کی پیدائش ہو گی۔ جب آدمی اپنی قدر و منزلت پہچان لے گا۔ جب ایک ایسا نظام جنم لے گا جس میں مساوات، برادری، مفاہمت اور انسیت کی شمعیں ضو فگن ہوں اور اس نظام کا ہر فرد انفرادی برقراری و سالمیت پر اجتماعی برقراری کو فوقیت و ترجیح دے۔ یقین کر لو۔ یہ افلاس ہماری خود کی پیداوار ہے۔ اس افلاس۔ غریبی۔ بھوک۔ برہنگی۔ مفاصدین اور لاچاری کو فرو کرنے یا زیر کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی میں امداد باہمی کا جذبہ پیدا ہو جائے اور انسان اس لیے رشتہ، دنیا کی ناپائیداری کو ہر وقت ملحوظ خاطر

دیکھے"۔۔۔۔ لمحہ بھر کے لئے انور نے چپ سادھ لی اور عذرا کو اپنی طرف متوجہ پاکر آگے بڑھنے لگے۔۔۔۔۔ "یہ سچ ہے کہ اس سٹھرے معاشرے کی تشکیل خاص کر آج کے اس دور میں ممکن نہیں ہے جب کہ انسان کی پہچان اُس کی علمیت، اخلاقِ حسنہ یا نیک کرداری کے بل پر نہیں ہوتی بلکہ بنک بیلنس۔ بلند قامت محل۔ رنگ برنگی موٹریں اور جاگیریں ہی انسان کو درجہ بخشنے کے زینے تصور کئے جاتے ہیں۔۔۔۔ اس دور میں جب کہ آدم نزادہ اپنی وقعت و اصلیت کو فراموش کر گیا ہے۔۔۔۔ غریبوں و لاچار لوگوں کو اپنی غربت و لاچاری کی بھٹی دراکو پیوند لگانے کی غرض سے ایسے حربے استعمال میں لانے ہی ہیں۔۔۔۔ وہ سب کے سب مجبور ہیں۔۔۔۔ انہیں اپنا و اپنے سے وابستگان کا شعلہ شکم بجھانے کی خاطر بھکاریوں کا لباس زیب تن کرنا ہی ہے اور لبا اوقات یہ لوگ اس بے بسی کی حالت میں انہی پگڈنڈیوں پر ہمیشہ کی نیند بھی سو جاتے ہیں۔۔۔۔ ان کی بربادی یا موت پر کوئی کفِ افسوس ملنے والا بھی نہیں ہوتا۔ ان کی زیست یہی ہے۔۔۔۔ رونا۔۔۔۔ تڑپنا اور سسکنا۔۔۔۔ اور اپنی زندگی کو نازندگی بنانا۔۔۔۔"

انور کی لمبی چوڑی تقریر سن کے عذرا کے چہرے پر بشاشت کے نقوش ہویدا ہوگئے۔ اور کچھ مزید جاننے کی ٹوہ میں گویا ہوئی۔

"آپ تو اچھے خاصے فلاسفر بھی ہیں۔۔۔۔ میں تو سمجھی تھی کہ انہوں نے بلا محنت سرمایہ حاصل کرنے کی غرض سے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔"

"ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان بھکاریوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ جائے غور ہے کہ کون بے سرو سامانی سے ہم آہنگ اس کڑکتی دھوپ میں سڑکوں کی خاک چھانے راہ گیروں کے آگے دست سوال دراز کرے ... عذرا ایک بھکاری بھی انسان ہوا کرتا ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ جس میں محسوسیت اور درد کا مادہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہم جیسوں کی طرح ..... سچ تو یہ ہے کہ مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی۔ یہ لوگ بھی مجبور ہیں۔ تسلیم رضا کے پابند ہیں ـــ زمانے کی چیرہ دستیوں اور عصر کی بدلتی ہوا نے انہیں معاشرے سے کوسوں دور لا پھینکا ہے۔ ماحول، سوسائٹی اور برادری سے خارج کر کے ان ننگی تنگ پاتھوں اور گم نام راہوں پر زندگی کی رہی سہی قدروں کو کھونے کے لئے!"

ممکن ہے باتوں کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہتا۔ لیکن کنڈکٹر نے ہارن دے دیا۔ جلدی جلدی باولی سے پانی نوش کئے وہ دونوں باقی لوگوں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئے ..... پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ جس کے دامن میں بل کھاتی اور اونچی نیچی سڑک پر گاڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔ بار بار انور ونور محبت میں عذرا کی سیٹ کی جانب جھک سا جاتا اور ہر بار ایک خوش کن مہک کی دل آویز چاشنی اُسے سونگھنے کو ملتی۔

کھلانی چھوڑ کر اب گاڑی ڈوہ پُل پر جا رکی..... انور کی منزل آ گئی تھی۔ اُسے اُترنا تھا۔ گاڑی سے اترتے عذرا کی ...

نے انور کا پیار بھرے لہجے میں شکریہ ادا کیا۔ انور نے دیکھا کہ عذرا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیر رہے تھے۔ اپنے آپ پر ضبط پاتے اس نے الوداع کہا .... اور گاڑی آگے کو چل پڑی۔ آنکھوں سے اوجھل ہونے تک عذرا کھڑکی سے سر باہر کئے انور کو دیکھتی رہی۔

—— انور کی حالت دگرگوں تھی۔ عذرا کی بابت وہ زیادہ سے زیادہ سوچنے لگا۔ اس کی جدائی اس پر شاق گذرنے لگی .... اس سراسیمگی میں غرق وہ اپنی امّی جان و بہن نزہت سے دل کھول کر باتیں بھی نہ کر پایا۔ سرسری طور ادھر کی کہہ اور ادھر کی سن وہ بیٹھک میں گھس کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

ماں نے لاکھ جتن اپنائے کہ بیٹے کی دل کی بندگرہ کھول سکے .... اور بہن نزہت نے لاکھ کوشش کی کہ بھائی انور کی پریشانی کا حال جان سکے .... بے حد اصرار کرنے پر انور نے سارا ماجرا امّی جان سے کہہ دیا —— ساری کہانی بیاں کیا کر دی کہ امّی نے خدائے تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس کے بیٹے نے آخر کار کسی ایک لڑکی میں دل چسپی دکھائی ....
اس نے انور کو یقین دلایا کہ وہ عذرا کو اپنی بہو دیکھنے کی غرض سے عید کے بعد ضرور حیدرآباد جا کے اس کے والدین سے بات کرے گی۔

—— دل کا اُبال نکالے اور پھر امی جان کی یقین دہانیوں کے پیش نظر انور خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ اور بشاشت کے مارے رات دیر گئے تک وہ جاگتا رہا ..... عذرا کو اپنے قرین پانے کی نسبت خیالات اس کے ذہن میں لاوے کی طرح پھوٹ پڑے ...... وہ بہت مسرور تھا ..... بے حد جیسے دُنیائے جہاں کی تمام خوشیاں سمٹ کر اس کے دامن میں آگئی ہوں۔ اُسے اپنی اس کامیابی پر بڑا ناز ہونے لگا۔

—— صبح سویرے منہ ہاتھ دھو اور شیو بنا۔ جونہی انور نے بہن نزہت سے ریڈیو کا بٹن آن کرایا تو جموں اسٹیشن نے یہ خبر نشر کردی کہ "کل شام بھدرواہ جانے والی گاڑی راستے میں ہی الٹ کے گہری کھائی کی نذر ہو گئی۔ ماسوائے کلینر کے سب جان بحق ہو گئے"

انور کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے زہریلے سانپوں نے اُسے جگہ جگہ کاٹ کھایا ہو ..... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ..... پاؤں ڈگمگانے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل جاتا درد والم کے ہجوم نے بُری طرح اُسے لپیٹ لیا اور وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین بوس ہوا۔

▼▼

درد کی دوا

—— امجد نے غصے کی حالت میں اور برہمی کے عالم میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی! وہ طبیعت کا بُرا نہیں تھا۔ لیکن مزاج میں غصہ بےحساب تھا۔ ذرا سی بات پر برہم ہونا اور ندامتی توازن کھو دینا اس کی فطرت میں تھا۔ تند مزاجی اُس کی جبلت میں جاگزیں تھیں —— لیکن یہ مغلوب الغضب حالت وقتی ہوا کرتی تھی! پارہ چڑھتا اور پھر اُتر جاتا.... جب اُس کا غصہ اُتر جاتا تو وہ پہلے جیسا ہی بھلا آدمی بن جاتا تھا..... خندہ پیشانی سے ملا کرتا تھا اور ہر کسی سے دل کھول کر باتیں کر لیا کرتا تھا۔

امجد روشن خیال و ترقی پسند تھا۔ عورت کے متعلق اُس کے خیالات مستند اور بلند قسم کے تھے۔ وہ عورتوں کو عام مردوں کی

کی طرح مرد کا غلام تصور نہ کرتا تھا۔ بلکہ عورت کو مرد کا ہم پلہ و ہم ساتھی خیال کرتا تھا..... ملک و قوم کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی خاطر عورت کو ایک اہم و سُود مند حربہ جانتا تھا..... اُس کے اخلاص کی بیوی کے باہمی تعلقات مجموعی طور پر نہایت ہی خوشگوار تھے! لیکن اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھار معمولی بات پر دماغی توازن کھو بیٹھتا۔ اور وہ دبی کچھ دھرانا اپنا فرض جانتا تھا جس سے باقرار ماحول میں آشوب پذیری سے چھا جاتی تھی...... اپنی شریک حیات سے اُسے بے لوث محبت تھی.... جنوں کی حد تک..... اور وہ اس کا احترام بھی کرتا تھا۔ لیکن جب وہ برہم ہوتا اور اس کے مزاج کے ساگر میں تلاطم مچ جاتا تو وہ الفت و احترام باقی نہ رہتا تھا.... اور امجد محبت و پیار جتانے والا شوہر ہونے کے باوجود اپنی بیوی کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا...... وہ اپنے آپ کو قابو میں کرنے سے بھی رہ جاتا تھا...... یہ کیفیت زیادہ عرصہ قائم نہ رہتی۔ وہ جلد ہی ہوش سنبھالے اپنی کوتاہی کو صدق دل سے محسوس کرتا یا پھر اپنی بیوی کی غلطی درگذر کرتا۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو جاتے۔"

امجد کی بیوی راشدہ بھی روشن خیال اور روشن ضمیر تھی! اور وہ مہر و وفا کی ملی جلی تصویر تھی! لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی جان لیجئے کہ وہ طبیعت شناس نہ تھی!...... راشدہ لبشناس تھی کہ اُس کا شوہر روشن طبع ہے اور عورت کو اپنا غلام یا ماتحت خیال نہیں

کرتا۔ لیکن مزاج شناسی کی قدروں سے ناواقف و بے بہرہ ہونے پر وہ امجد کی مغلوب الغضب فطرت کو اہمیت نہ دیتی تھی... وہ اس کی طبیعت میں پیدا شدہ طوفان بھانپنے سے رہ جاتی.... درحقیقت وہ خود بھی مزاج کی گرم و تیز تھی۔ اسی باعث وہ لاچار تھی کہ کسی بھی بات کی تہہ تک جا کے اصلیت جاننے کی نسبت سوچتی۔ .... اس خاطر دونوں میں بسا اوقات ناچاقیاں جنم پاتیں اور دونوں میں "توں توں" "میں میں" ہوا کرتی تھی۔ یہ سرد جنگ تھوڑے دیر کی مہمان جاتی تھی۔ اور اگر غضب ہی ہو جائے تو دن بھر کی! مجموعی انداز میں دونوں کی زندگی اچھے انداز میں بسر ہو رہی تھی!

امجد راشدہ سے مطمئن اور خوش تھا۔ لیکن اپنی بے توازن و بے ہنگم طبیعت سے مطمئن نہ تھا۔ اس نے حتی الوسیع کوشش کی کہ اپنی طبیعت میں توازن کی لہر دوڑا دے۔ مگر کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی اور نہ ہوتی.... ساتھ ہی اپنی بیوی کو مزاج ناشناسی کی کمزوری سے وابستہ پائے وہ غیر مطمئن سا تھا.... اس کے جمعیت خاطر حاصل نہ تھی۔ کبھی اپنی ازدواجی زندگی کی بابت سوچا کرتا تو اس کے سامنے انجام بھیانک و اندوہناک نظر آتا۔ اس کی طبیعت گھبرانے لگتی.... اس میں سراسیمگی سی دوڑ جاتی۔ دل و دماغ کی وسعتوں میں ہیجان سا بپا ہوتا.... لیکن جلد ہی وہ اپنے دل کو سمجھا کر ان بھیانک و دل سوز تصورات کی طرف آنکھیں بند کر لیتا اور بلا کسی تمہید و انتساب کے اپنی بیوی سے کہتا:—

"راشدہ لگتا ہے تمہیں خداوند نے میرے لیے ہی پیدا کیا تھا.... ہاں.... ہم دونوں نے ایک دوسرے کی خاطر جنم پایا ہے۔ ہم دونوں تا دم زیست جدا نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ارتباط و باہمی اخوت سے ہی چمن زندگی کی خود آرائی و لچک برقرار رہ سکتی ہے"۔

راشدہ چونک جاتی۔ یقین دلانے کے انجان ڈھنگ سے وہ گھبرا اٹھتی اور پوچھ لیتی!۔

"آپ کا مطلب؟.... میں نہیں سمجھی! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ذرا مفصل بتلایئے"۔

امجد راشدہ کے اس سوال کو ان سنا کر دیتا یا ٹال دیتا۔ دراصل نظر آنے والے بھیانک و پریشان خوابوں کے مجمعے کی عقدہ کشائی وہ راشدہ کے روبرو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہولناک منظر دیکھ راشدہ کو بھی دکھی ہونا پڑے۔

—— بدقسمتی سے ہوا وہی۔ جس کے تصور و اندیشے سے ہی امجد کا دل لرز جاتا تھا اور رواں رواں کانپ اٹھتا تھا۔ ایک روز باتوں باتوں میں دونوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوا.... معمولی باتوں نے سنجیدگی اپنائی اور جھگڑے کی نوعیت بدل گئی.... اور امجد سرعت کے ساتھ اپنی نفرت سے مجبور ہوئے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا.... تلون مزاجی عود کر آئی.... اور کچھ عرصہ بات کرنے کا سلسلہ منقطع رہا..... لیکن اس دوران بھی راشدہ کی تند مزاجی اس سے خاموش سر

رکھ سکی بلکہ اُس کی زبان برابر کام کرتی رہی ...... وہ اپنی عادت کے باعث اپنے شوہر کی خاموشی کو برداشت نہ کر سکی .... اور ہر روز جلی کٹی سنانے میں کامیاب اترنے لگی .... جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امجد بے اختیار ہوتے غصّے کی حالت میں آکر اپنی بیوی کو طلاق دے بیٹھا .... لڑائی جھگڑے کے باوجود راشدہ اتنی کڑا ھی، دہشت اور سخت سزا کی امید امجد سے نہ رکھتی تھی ...... امجد کی زبان سے لفظ "طلاق" سن کر اُس کے تمام حواس پر ہزاروں من اوس سی گر پڑی .... تمام شریر میں بجلی سی کوندنے لگی .... ہر قسم کی اہلیت اُس سے جواب دینے لگی. .... اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رگ رگ میں سے درد سے چینی پھوٹنے لگی۔ .... سارا جسم پتھر کی مورتی کی طرح سن پڑ گیا .... راشدہ اسی حالت میں بہت دیر گئے تک کھمبے سے ٹیک لگائے پڑی رہی .... اور اس دوران امجد نے بھی ہوش سنبھالا .... اُس سے بڑھ چڑھ کر اپنی غلطی کا احساس ہوا ..... اور وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوتے پچھتانے لگا۔ اس کی تمام کی تمام اہلیت پھر سے کام کرنے لگی ..... اس نے نزدیدہ نگاہوں سے راشدہ کی طرف جھانکا۔ اس کی ابتر حالت کو بھانپا .... راشدہ کی بے ترتیب حالت دیکھ وہ دیوانوں کی طرح اندر ہی اندر بڑبڑایا .... جنونی کیفیت اُس اور اُس کے حواس پر سوار ہو گئی تھی .... مگر اب کیا ہو سکتا تھا .... تیر کمان سے نکل چکا تھا اُس نے شریک حیات کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا .... اب امجد کے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا ..... طلاق .... طلاق ... طلاق ....

اس طرح کی مخلوط آوازیں در و دیوار سے آنے لگیں اور اس کے آرام کو حرام کرنے میں کامیاب اتریں ..... اور وہ تاب نہ لاکر رو اٹھا۔ بچوں کی طرح ..... چاروں جنت اندھیرا چھانے لگا ..... خوفناک اندھیرا ..... وہ اور اس کی جرأت مندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی اور وہ وہیں فرش پر ڈھیر ہوا ———— راشدہ پہلے ہی عالم بے ہوشی میں پڑی تھی! اُس سے اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ وہ امجد کی خبر لیتی یا اس کا حال پوچھتی ..... لیکن وہ اب ایسا کیوں کرتی۔ اب امجد کے ساتھ اس کا کیا رشتہ نہ تھا۔ امجد اب اس کے لئے غیر مرد کے برابر تھا ..... غیر مرد ..... اور وہ اس کے لئے غیر عورت ..... پرائی عورت ..... یہ سوچ کر راشدہ بچوں کی طرح زار و قطار رو اُٹھی اور اس گھر کو خیر باد کہنے کی نیت سے کمرے سے باہر آگئی۔

اپنی تلون مزاجی و تیز طبیعتی کے باعث امجد اپنی بسی بسائی دنیا برباد کر چکا تھا ... اُس نے اپنے چمن زندگی کی خوبصورتی و خود آرائی کو مسخ کر کے رکھ دیا ... شجر زلیست کو پھلنے پھولنے سے پیشتر ہی نذر آتش کر دیا ..... وہ دیوانوں کی طرح بسر اوقات کرنے لگا ... اس کا دل کسی چیز میں نہ لگتا تھا۔ نہ اُس سے تسکین و سکون حاصل تھا۔ راشدہ کی عدم موجودگی میں اُس سے سب کچھ سُونا سُونا سا لگنے لگا ... سُونا سُونا اور بے کیف ..... ہر چیز گھر کی اُس سے کاٹنے لگی ..... دوسری طرف راشدہ بھی مایوسی و اداسی کی ملی جلی تصویر بنی زندہ لاش کی سی زندگی گذار رہی تھی ..... اُس سے بھی چین حاصل نہ تھا۔ نہ ملی دھارس نام

کی نعمت سے واسطہ ..... اس کا سب کچھ جیسے لٹ چکا تھا ... چھینا گیا تھا اور اُس سے اِس دنیا سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگی! ـ ـ ـ ـ در حقیقت راشدہ اپنے کئے کا پھل بھگت رہی تھی۔ کیونکہ وہ با اخلاق و راست کرداری کی دولت سے مالا مال ہونے پر بھی طبیعت پرکھنے اور مزاج شناسی کا مادہ اپنے میں کم رکھتی تھی۔ ورنہ یہ دن اُسے نہ دیکھنے پڑتے۔ اس حشر کی سی بر بھی اُس کے حصے میں نہ آتی ـــــ امجد بیٹھک میں گھستا تو راشدہ کی آرائش و زیبائش دیکھ کے اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے۔ وہ پھر گھنٹوں نہیں سنبھلتا ..... راشدہ کا وہ طریقہ ... قرینہ اور سلیقہ یاد کر کے اس کے ہوش و حواس اڑ جاتے تھے .... وہ تلملا اٹھتا تھا .... اپنے کئے پر کفِ افسوس ملتا تھا .... راشدہ کو موتیا کے پھولوں سے زیادہ پیار تھا۔ وہ روزانہ ان پھولوں کی مالا خرید کے اپنے کمرے کی سیدھی دیوار پر آویزاں امجد کی فوٹو پر چڑھایا کرتی تھی۔ ... اور پھر اُسی تصویر پر نظر جمائے کچھ سوچا کرتی تھی! .....

ہونٹوں پر تبسم کی لہر لئے .... آنکھوں میں غیر معمولی بشاشت ..... راشدہ کے چلے جانے کے بعد امجد نے اس اہتمام کو جاری رکھا۔ بلا ناغہ پھولوں کی مالا خرید کے اس سے تکمیل زینت بخشتا تھا ... مگر بڑی تفاوت تھی ..... راشدہ اور اس کی حالت میں .... اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ... ہونٹوں پر یاسیت کی تہہ جمی ہوئی اور چہرہ پر مایوسی کے اثرات نمایاں ہونے ـــــ دن گذرتے گئے ...

دونوں طرف سے خاموشی چھائی رہی۔ کسی طرح کا آمنا سامنا نہ ہوا۔ دفتر سے تھکا ماندہ جب ایک روز امجد گھر آیا تو ذہنی بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر اُس نے ریڈیو کا بٹن دبایا.... ریکارڈ بج رہا تھا...

تجھ سے بچھڑ کے زیست کی لذت فنا ہوئی
تم کیا گئے کہ سو گئیں خوشیاں مزار میں
کب تک رہے گی یہ رخی تمہاری برقرار
عہدِ شباب لٹ گیا اس انتظار میں!

گانے والے کی آواز میں سوز تھا.... امجد دم بخود بنا گانا سنتا رہا ریکارڈ ختم ہونے سے قبل ہی اُس نے ریڈیو بند کر دیا۔ اضطرابی انگاروں نے اُسے جھلسانا شروع کر دیا۔ راشدہ کی یاد پھر بُری طرح ستانے لگی۔ گئی گذری ایک ایک یاد اُس کے دل میں تیر و نشتر بن کر چبھنے لگی .... حال کے نقوش غائب ہو گئے۔ ماضی کے دھارے پھوٹے اور والہانہ انداز میں پھوٹے.... اُسے موسم بہار کی وہ سہانی دلفریب شام یاد آ گئی! جب وہ راشدہ کو لے کر گاؤں اپنے ماموں جان کے پاس گیا تھا.... وہ دونوں کس قدر خوش اور مطمئن تھے!.... راشدہ جیسی بیوی پا کر امجد کس قدر مغرور تھا۔ اس کے دل سے آواز نکلی تھی! سے

میری زندگی میں شامل جو نہ تیرا پیار ہوتا
تو نشاطِ دو جہاں بھی مجھے ناگوار ہوتا!!

موسم کی کیف پرور مستیاں.... فضا کی پُر ادا خاموشی.... قدرتی مناظر کی دل آویزی.... نشیب کی طرح رواں دواں ندی کا منظر....

پگڈنڈی کی لہرانی چال...... مدہوش کرنے والی پُربہار ہوائیں....
اور پھر راشدہ کا بُت نما حسن .... اور اُس کی آواز کا درد .... کچھ اس
طرح کا سماں بندھا کہ امجد بے خود ہو گیا .... جیسے اُس نے خُم کے
خُم حلق پر انڈیلے ہوں .... راشدہ نے اُس سے سہارا دیا اور
پھولوں سے اٹے پڑے کُنج سے گذرتے اس نے یہ شعر گنگنایا تھا ؎

چھائی ہوئی ہے باغ پر رنگینی بہار
رنگینی بہار پہ چھائے ہوئے ہو تم

.... ساتھ ہی معنی خیز نگاہوں سے امجد کی طرف جھانکا ...... اور امجد
کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیرنے لگے۔ خوشی کے آنسو .... فرطِ مسرت میں
دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے .... پیار کی گرفت مضبوط ہو گئی!
.... الفت کے حلقے ابھرنے لگے۔ اور نہ جانے کتنی دیر گئے تک وہ
ایک دوسرے کی پیٹ کو سہلاتے رہے ——— ..... "چھوٹے
مالک چائے لاؤں"..... امجد چونکا۔ ماضی کی وادی سے وہ ایک بار پھر
پلٹ پڑا .... یہ ماما فرحت تھی ——— امجد کی حالت غیر تھی ....
وہ جاذبیت نہ تھی جو کبھی اُسی کا طرۂ امتیاز تصور کر دی جاتی تھی!
آج ریڈیو پر غزل سن کر اُس میں سراسیمگی کی لہر موجزن ہونے لگی
.... اُس کے دماغ میں ہیجان سا بپا ہوا .... اور پھر غیر اضطراری
طور زبان کام کرنے لگی .... یقیناً راشدہ تیرے بغیر زندگی کی لذت
سے ہاتھ دھونا پڑا ہے .... میری ہر خوشی مجھ سے دور ہے ....
ہاں میں بے بس پڑا۔ تمہارے بن میں کچھ بھی نہیں کر پاتا ....

لگا —

"راشدہ سے میری خوشی، مسرت وابستہ ہے۔"

"وہ میری زندگی میں راحت کا پیامبر بن کر اور شادمانی کا نقیب بن کر آ گئی تھی۔"

"مجھے راشدہ سے محبت تھی اور اب بھی ہے۔"

"میں اُس کے بغیر زندگی نہیں گذار سکتا۔ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"کیا راشدہ اب بھی میری بن سکتی ہے" — اور پھر امجد نے بڑے دردناک لہجے میں گنگنانا شروع کر دیا۔ ؎

تجھ سے بچھڑ کے زیست کی لذت فنا ہوئی
تم کیا گئیں کہ سو گئیں خوشیاں مزار میں!!

تھوڑی دیر یہ سلسلہ جاری رہا .... اور پھر بے قابو ہو کر اس کی آنکھوں کے حلقے پھر سے نم ہو پڑے اور ٹپ ٹپ آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی ..... دل میں آگ لگتی ہے۔ تو آنسوؤں سے ہی بجھتی ہے۔ ... وہ روتا رہا ... بلک بلک کر ... اور پھر جب اشکوں کا خزانہ لٹا بیٹھا تو اُس کا بوجھل جی کچھ ہلکا ہو گیا ... وہ سوچنے لگا مستقبل کی بابت ... وہ اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کی خاطر راشدہ کو پھر سے اپنے قریب کرنے کی بابت واضح طور سے سوچنے لگا ... وہ چاہتا تھا کہ راشدہ کو پھر سے اپنے قریب کر دے ... لیکن یہ کیسے ممکن تھا ... جب کہ مولویوں نے فتویٰ دے دیا تھا۔ فیصلہ سنا دیا تھا کہ طلاق ہو چکی ہے ... اور اس طرف سے مایوس ہو کر

امجد نے براہ راست راشدہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کردی... اُس نے موثر انداز میں درد بھرا خط راشدہ کو لکھا۔ آغاز اُس شعر سے کردیا۔

س ۵ لو حشر کے آنسار ہیں رنقہاں تیرے بغیر
یہ دنیا لگ رہی ہے برنندان تیرے بغیر

—— امجد نے اس خط میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ساتھ ہی اپنی فطری عادت سے لاچاری ظاہر کرتے ہوئے آمنے سامنے ہو کے باتیں کرنے کی درخواست پُرزور الفاظ میں کی...... اور اپنی خستہ حالی کی چند ایک جھلکیں دکھا کے اپنے روشن مستقبل کی بھیک اُس سے مانگی۔

—— راشدہ نے خط کا جواب تو دے دیا۔ لیکن امجد کو ملنے سے معذوری ظاہر کردی۔ خط کا نفس مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

س ۵ دُور لے چل اے دل برباد اس دُنیا سے دُور
رہزنی ہوتی یہاں تو رہبری کے روپ میں

"میں اور آپ سے ملوں۔ یہ بے وطیرہ و نامناسب کیا اپنے میں اپنے خداوند کے حضور میں گنہگار نہیں کہلا سکتی —— اُس طرح کا سوچا بھی میری غیرت گوارا نہیں کر سکتی کہ میں غیر مرد کے روبرو ہو جاؤں۔ آپ نے میری زندگی کو تباہ و برباد، میری جیون نوکا کو نذر گرداب اور میری دنیائے زلیست کی قدروں کو پامال کر کے جو گناہ عظیم سر لیا ہے اس کا کفارہ میری ذاتی رائے میں فقط اس طرح چکا سکو گے کہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش سدا کے لئے

ترک کردو۔ اور تم بانی زندگی عورت و مرد کی باہمی تضاد کو
ختم کرنے میں صرف کردو۔ تاکہ پھر کبھی کسی میری جیسی بہن
کو اس قیامت کا سماں دیکھنا نصیب نہ ہو سکے جو مجھے ہوا۔
خصوصاً مجھے..... میں اس کے سوائے آپ کو کوئی اور
مشورہ نہیں دے سکونگی!"

اور آج امجد حقوق نسواں کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس
کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ عورت و مرد کو ایک دوسرے
سے قریب تر لانے میں مساعدت کا ہاتھ دراز کرے۔ اب
تو یہ اکیلے پن کو زندگی اُسے راس آگئی ہے۔

اندھیرا اُجالا

ششو نے تھیکری اٹھائی اور لبوں تک لے آیا۔ "اس کے دل میں تمنّا اُبھری۔ آرزو جاگ اٹھی۔ آنکھوں کے آنسو دل کی آگ بجھانے میں کوشاں تھے۔ اِن آنکھوں میں غربت اور عسرت کی تصویر جھلک رہی تھی۔ جس کے سیاہ نقش و نگار مصور نے ادھورے چھوڑ رکھے تھے ..... ناتمام نقوش .... اور مدھم لکیریں .... سب سیاہ .... شب ہجراں سے بھی ــــ مگر اُس کے چہرے پر سیاہی نہ تھی صرف سیاہ غربت کی سیاہی نے اسے اپنے آنچل میں لیے رکھا تھا۔ زمانے کے تھپیڑوں نے اسے بے بس بنا دیا تھا"۔

ــــ نو عمر ششو! جو زندگی کی بیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ نا معلوم اس کا دل کتنی ناکام آرزوں کا مدفن تھا۔ کتنی تمناؤں کا گلا

اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی نہ مر تیں... سسکتی رہتیں!! سچی بات تو یہ ہے کہ ششو نے ایک ذلیل زندگی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ اپنی غیر بہنوں کو بازار میں نہیں لایا۔ اُس نے اپنی ماں کے آگے بھیک کے ٹکڑے نہیں رکھے۔ زمانے کی گردش نے ششو سے جو ذلیل کام کروانا چاہتی تھیں اُس نے وہ نہیں کیا۔ اس کی غیرت زندگی کے آگے کبھی نہ جھک سکی۔ وہ زندگی کے عین مقابل سے سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے گذر گیا۔ ایک فاتح کی طرح زندگی کو نیچا کر کے دکھا کر چلا گیا۔ اس کا باپ طاعون کا شکار بن گیا تھا۔ ششو سب کچھ کھو کر باپو کو بچا لینا چاہتا تھا۔ مگر افسوس کسی دوانے کام نہ کیا۔ آہ انسان نے انسان کو ہلاک اور تباہ و برباد کرنے کے لئے ہزاروں آلے ایجاد کر ڈالے۔ مگر موت کے چنگل سے نجات دلانے کے لئے ایک بھی آلہ ایجاد نہ کیا۔ بڑا بھائی شیرو سنہ ۱۹۴۷ء کے دور میں خونخوار درندوں کا لقمہ بن کر رہ گیا تھا۔ باپو اور بھائی کی موت نے ششو کی حالت اس ملاح کی سی بنا دی تھی جس کی کشتی بھنور بھرے سمندر میں پھنسی ہوئی ہو۔ جہاں بربادی ہولناکیوں کے ساتھ اُسے تباہ کرنے کے لئے کمر بستہ کھڑی ہو۔ ——

اب تو شام ہو رہی تھی۔ سورج مغربی افق پر الوداعی جھلک دکھا رہا تھا۔ گھٹیاں اُداس اُداس نظر آرہی تھیں۔ جنگل کے چرند و پرند خاموش گردن جھکائے واپس لوٹ رہے تھے۔ کسی کی آہٹ

سن کے ششو ادھر اُدھر تکنے لگا۔ یہ برجو تھا۔ ششو نے ایک گنگناتی نظر برجو پر ڈالی اور کہا ..... "برجو! تم پھر آ گئے۔ یاد رکھو اپنے دلفریب جال میں شکار پھانسنے کے لئے تمہیں تو روز روز آنا پڑیگا۔ روز ____ روز ____ اب رہا میرا سوال۔ برجو! میں اپنی منزل کی تلاش میں تب تک چلوں گا۔ جب تک نہ میں تھک کر چور چور ہو جاؤں.... میں چلتا رہوں گا۔ پہاڑوں کو چیرتا ہوا .... میدانوں کو پھاندتا ہوا۔ ____ مجھے دیکھنا ہے کہ انسانیت کا مسکن ہے کہاں؟ ہاں! ہاں میں دیوتاؤں کا وہ دیس پانا چاہتا ہوں۔ جہاں انسان بستے ہیں۔ جہاں پریم کے دور چلتے ہیں۔ جہاں ہمدردی نس نس میں سرایت کر چکی ہو۔ جہاں مذہب کی آڑ لے کر بے کسوں کا جینا حرام نہ کیا جاتا ہو..... اور تم برجو! میں جانتا ہوں تم شہر سے گاؤں کیوں آتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گاؤں آنے کا مدعا کیا ہے۔ اچھا جاؤ! سیدھے چلے جاؤ! یہ پگڈنڈی تمہیں ایک ایسے گاؤں تک ساتھ دے دے گی جہاں تم ٹکوں کے عوض عصمتوں کے پیرہن چاک کر سکو گے۔ جہاں غریبوں کی غربت اور بے کسوں کی بے کسی سے کھیل کر اُن کا جینا دوبھر کر سکو گے۔ جہاں الہڑ جذبات سے کھیل سکو گے۔ جاؤ! برجو میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ جاؤ! پھر شہر میں جا کر ان بے بس مٹی کے پتلوں کی برہنگی کے نقوش کھینچنا۔ اُن کے حسن و جمال کے افسانے، ان کے سینوں کی زیر و بم کہانیاں یار دوستوں کو سنانا ____ یہی کچھ تو آج کل کے نام نہاد انسان کا کام ہے۔" ____

اتنا کچھ کہہ کے شنشو کی نگاہیں پہاڑ کے اس پار پڑیں۔ جو برف کی قبا پہنے اپنی بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ پہاڑ۔ جہاں سندری کو سیاہ خیمے والا اغوا کر لے گیا تھا۔ جہاں شہری اور باشوں نے پیاری کو ننگا کر دیا تھا۔ جہاں درندہ نما منشوں نے رینا دیوی کی عزت انتقام کی آگ بجھانے کی خاطر لوٹی تھی ـــــ اتنا کچھ سوچنے کے بعد شنشو کانپ اٹھا۔ اس کی آنکھوں سے دو موتی ٹپکے اور اس کے پچکے ہوئے گالوں پر پھیل گئے۔ وہ للکارا ـــــ "برجو!! یہ دنیا کیسی ہے۔ اور دنیا والے کتنے ظالم۔ اس دنیا میں بسنے والے انسان نہیں بلکہ حیوانوں سے بدتر ہیں۔ میں اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتا۔ جہاں دردمندوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ جہاں بے کسوں کے ارمانوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ جہاں بے بسوں کی جیتی جاگتی امنگوں کو پیوند خاک کر دیا جاتا ہے۔ جہاں جوانی کی تڑپتی ہوئی روح کو رقص محفل بنا دیا جاتا ہے۔ جہاں انسانی جامہ زیب تن کئے شیطان بستے ہیں۔ جہاں کمزوروں کا حق زبردستی چھین لیا جاتا ہے۔ جہاں پھول چننے والوں کی راہوں میں کانٹے بکھیر دیئے جاتے ہیں۔ جہاں مظلوموں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ جہاں لاچاروں کی شکست خوردہ ہڈیوں پر عالیشان محل تعمیر کئے جاتے ہیں۔ جہاں ناداروں کی امیدوں کو نیم جان کر کے مذہب کے رنگ میں رنگ کر سوختہ کیا جاتا ہے۔ جہاں حقیقی انسان کی امنگوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اس کی لاچاری پر قہقہے بلند کئے جاتے ہیں۔ جہاں زر پاس

ہیں اور زر کی فراوانی ہو تو سب اپنے ہوتے ہیں۔ مگر جب وہی انسان زمانے کی گردش کے باعث بے بسی کی بھیانک سیڑھی پر قدم رکھتا ہے۔ تو سب کے سب پرائے ہو جاتے ہیں۔ عزت اور شہرت سب ختم ہو کر رہتی ہے..... جہاں مذہب، سماج اور سوسائٹی کے گندے کیڑے پلتے نظر آتے ہیں اور روزانہ ہزاروں انسان انسانیت کو بھول کر ان کیڑوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کھوٹ اور حسد کا جنم پانا یقینی امر بن گیا ہے..... برجو! مجھے اس دنیا اور ایسے دنیا والوں سے نفرت ہے۔ جہاں مکاری اور فریب کے سوائے کچھ بھی نہیں..... جہاں لوگ صرف اپنا الو سیدھا کرنا جانتے ہیں۔ جہاں مکر و فریب ہی کام دیتا ہے۔ جہاں ایک صبح و شام لگاتار محنت کر کے اپنی زندگی کو نا زندگی بنا دیتا ہے اور دوسرا اس کی محنت کا پھل کھا کر عیش کی زندگی بسر کر لیتا ہے ____ "اف بھگوان!! کہاں ہے۔ آپ کی بھگتی! کہاں گیا آپ کا انصاف!! اگر یہی تیری دنیا ہے تو مجھے اس دنیا سے اٹھا لے..... میں اب بیزار (Fed up) ہو چکا ہوں۔ میں نے اس دنیا میں کیا کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے انسان کو انسان کے منہ سے لقمہ چھینتے دیکھا میں نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے خون سے ہاتھ رنگتے پایا۔ اب اس سے آگے کیا دیکھنا باقی رہ گیا" ____ برجو! میں جانتا ہوں کہ تم شہر سے گاؤں کیوں آتے ہو۔ ہاں تم جاتے کیوں نہیں ہو" ____ برجو! بے حس و حرکت سب کچھ سنتا رہا۔ اس کی لہو لہان آنکھوں

سے آنسوؤں کی دو لڑیاں گر پڑیں اور شنشو سے مخاطب ہوا —

"نہیں شنشو! تم نے مجھے غلط جان لیا ہے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ میں صرف سیر کی غرض سے یہاں آیا ہوں تب مجھے غلط نہ سمجھو۔ شنشو! کیا ہوا اگر سنہ ۱۹۴۷ء کے سیلاب نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ کیا ہوا اگر انسانیت کے خونخوار درندوں نے منشا اور شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مگر میں نہیں بدلا۔ میں وہی برجو ہوں جو ہر وقت تمہارے درد کو اپنا درد سمجھتا رہا۔ یاد کرو شنشو وہ زمانہ جب ہم اس فردوس نما وادی میں اکٹھے پل کر جوان ہوئے تھے۔ اور پھر...... نہیں! نہیں۔ شنشو بات کاٹتے بول اٹھا۔ نہیں برجو! اب یاد نہ دلاؤ وہ واقعات جو خونین اور غم انگیز ہیں۔ اب تو اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ کچھ سن سکوں۔ میں کچھ بھی نہیں سننا چاہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ برجو! تو مجھے بھائی شیرو کا حشر یاد دلا کر رُلانا چاہتا ہے۔ تو مجھے پیاری شیل کی برہنگی کا حال سنا کر تڑپانا چاہتا ہے۔ تم مجھے جلاوطنی کی داستان یاد دلا کر غمگین بنانا چاہتے ہو — مگر برجو! یہ تمہاری غلطی ہے...... سراسر غلطی...... میں تو کسی کی یورشوں سے اب اپنا پایا ہوا راستہ نہ چھوڑوں گا۔ میں تو ہوا کی گردش کی زد میں اب آنے والا نہیں — کیا ہوا اگر میرا سب کچھ لٹ گیا، کیا ہوا اگر میرے جینے کے سارے سہارے رد کر دیے گئے۔ کیا ہوا اگر میری جیون نوکا کو غرق ہونے کے لیے بھنور بھرے سمندر میں بے سہارا چھوڑ دیا گیا۔ مگر ہمت، حوصلہ اور صبر ابھی نہیں لوٹا گیا۔ بھائی بشیرو کی آخری خواہش

کہیں نہیں گئی۔ میں نے وہ پلے میں باندھ کر رکھی ہے — پیاری شیلی کی برہنگی کا حال میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر اس کا بدلہ اس سے نہیں چکایا جا سکتا کہ میں بھی کسی کی بہن کو ننگا کرکے چھوڑ دوں — نہیں! برجو ایک مکمل انسان ایسا ذلیل قدم کبھی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ انسان ہو کے یہ کرتوت بھم پہنچانا کہاں کا دھرم اور انصاف ہے..... برجو! میں جانتا ہوں کہ انسان نے انسان کا ہی خون کس طرح چوسا۔ وہ زمانہ میری نظروں میں ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بازار بھی جس میں اناج کی دوکانوں پر بھوک کا، میووں کی دوکانوں پر بیماری کا، کپڑوں کی دوکانوں پر برہنگی کا، کتابوں کی دوکانوں پر جہالت کا، دوائیوں کی دوکانوں پر موت کا اور زیورات کی دوکانوں پر عصمت و آبرو کا تول مول ہو رہا تھا۔ اس خوش نا وقت کی یاد اب بھی مجھے تڑپا دیتی ہے۔ جس کا ایک ایک دقیقہ بے گناہوں کے خون سے رنگا گیا تھا" ——

اتنا کہہ چکنے کے بعد شمشو اپنی جگہ سے اٹھا اور سامنے بہتے ہوئے دریا کی جانب رُخ پھیر کر برجو سے بول اٹھا — "بھگوان سا یہ پوتر دریا گواہ ہے کہ انسان نے درندانہ اور وحشیانہ روپ اختیار کرکے کیا کیا گُل کھلائے۔ کس طرح بے گناہوں کی رگوں سے پاک خون نکال کر اس دریا کی نذر کر دیا گیا — اس دریا نے بھی اُس وقت ماتمی قبا پہن رکھی تھی۔ انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر یہ دریا بھی مایوس لہجہ اختیار کئے سست رفتار میں بہے جا رہا تھا — بے بس انسانوں کی بے چینی چُپکے سے اپنی اجڑی ہوئی گود میں لئے اس دریا نے بھی اُس وقت بہت رو دیا تھا۔

....بہت رو دیا تھا.... وہی غم و درد اپنی پیشانی پر لئے یہ آج بھی رو رہا ہے اور برابر روتا رہے گا۔ جب تک انسان حیوان ہے تب تک روئے گا — جب تک حقیقی انسان پیدا نہ ہو گا تب تک روئے گا۔ تب تک....!! ———

"جاؤ! برجو! اب جاؤ بہت دیر ہو گئی۔ معاف کرنا میں نے تمہارا قیمتی وقت فضول باتوں میں ضائع کر دیا۔" یہ شنو کی آواز تھی۔ مگر برجو کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ جیسے اُس کے پاؤں میں اب چلنے کی سکت ہی نہ تھی۔ اُس کے دل اور دماغ میں عجب کشمکش پیدا ہو گئی۔ اُس نے گاؤں جانے کے بجائے اب پھر شہر کا رُخ کیا اور واپس چل پڑا۔ جیسے کسی نے اُسے گاؤں جانے سے روکا تھا۔ منع کیا تھا۔ — نہ جانے ایسا کیوں ہوا —.

▼▼

عکس

فضا ساکن تھی۔ اور جنگل اداس تھا۔

ہر طرف سکوت۔ ہر طرف خاموشی ..... گورستان کی سی خاموشی

اور سناٹا! شام کے ملگجے سائے پھیل چکے تھے۔

وہ کافی دیر سے بوڑھے چنار کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔

پھر وہ اُٹھی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

دُور دُور تک درختوں اور جھاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا

تھا۔ پاس ہی ایک نالہ بہہ رہا تھا اداس اداس۔ اور مرا مرا۔

اُس نے اپنے کھلے اور بے ترتیب بالوں کو اکٹھا کر لیا اور پاس پڑے

بید کے ٹکڑوں کی مدد سے نا تمام پٹارا مکمل کرنے لگی۔ پٹارا بنتے بنتے اس

کی آنکھوں میں پانی کے قطرے چمکنے لگے اور پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہونے

لگیں۔ وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے گرد و پیش کا غائرانہ طور پر جائزہ لینے لگی۔ وہ اب بھی کافی حسین و دل کش تھی۔

درمیانہ قد، اور چھریرے بدن کی حسین خدوخال اور مسحور کر دینے والی نگاہیں۔ مگر اتنے اوصاف کی حامل ہونے کے باوجود وہ حد درجہ مضمحل تھی۔ پٹارا اور بید کے ٹکڑوں کو کھلے پھار میں چھوڑ کر وہ چشمے کی جانب بڑھنے لگی۔ پانی کے دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر وہ بڑے ٹیلے پر بیٹھ گئی جہاں سے اس بستی کے گھاس پھوس کے بنے ہوئے کئی چھپر صاف نظر آ رہے تھے جس بستی کو خیر باد کہہ کر وہ اس سنسان بیابان میں رہنے لگی تھی۔ آہ سرد بھر کر وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اُس پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگی جس نے اُسے یہاں آنے میں ساتھ دیا تھا۔

وہ مردنی صورت بنائے نہ جانے کیا کچھ سوچنے لگی کہ آنکھیں بھر بھیگ گئیں۔ جیسے اُس کا سب کچھ لٹ چکا ہو۔ وہ سوچ کے بحرِ بےکراں میں غرق تھی کہ پاؤں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔ قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ ادھ کھلی آنکھوں سے خوف زدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"اب بھی تم میرا پیچھا نہ چھوڑو گے"۔

"کروں کیا زیبو! یہ میرے بس کی بات ہوتی تب تو ...... تمہارے بغیر چین نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں جب سے تم بستی چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ مجھے بستی اور بستی کی ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ تمہیں تم سے دُور رہ کر مجھے

کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ..... کچھ بھی نہیں ..... خدا کی قسم یقین کرو۔"

"یقین اور وہ بھی ایک مرد پہ؟"

"خدا جانتا ہے زبیدہ! میں دل لگی نہیں کر رہا۔ جب سے تم میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ کھانا، پینا، سونا۔ اور میں نے کبھی تسکین و اطمینان کی سانس نہیں لی۔ ہر وقت تمہیں دیکھنے کو ہی دل چاہنے لگتا ہے۔ اور تمہیں سامنے نہ پا کے میری حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ زبیدہ! تم میری زندگی ہو، میری دنیا ہو، میرا سب کچھ ہو! سب کچھ تم ہو زبیدہ۔"

"تمہاری دنیا اور وہ ایک عورت! نہیں نہیں۔"

"خوب زبیدہ! خوب۔ اڑاؤ تمسخر مجھ بدبخت کا۔ میں اسی قابل ہوں۔ زبیدہ تم نے یہ بے رخی اور سنگدلی کیوں اپنائی۔ آخر میں بھی اس کا باعث جان سکوں۔ ذرا سوچو کہ تم نے اپنی حالت کیا سے کیا بنا رکھی ہے۔ تمہیں اس حال میں اور اس پریشانی میں دیکھ کر میرے دل کا جو حال ہو رہا ہے اُسے تم نہیں سمجھ سکتیں۔

زبیدہ! میں تمہیں اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اُسی دن سے جب اس بستی میں آیا تھا اور تمہیں گھراٹ کے پاس دیکھا تھا۔ یاد ہے؟ تم نے میرا ساتھ چودھری کے گھر تک دیا تھا۔ میں اُسی گھڑی سے دل ہی دل میں تمہیں چاہنے لگا تھا۔ اور اب تو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ کیا میری محبت پر تمہیں یقین نہیں؟ ۔ زبیدہ اس وقت بھی بات ٹال کر مجھے تنگ نہ کرو۔

ظالم مجھے اس طرح نہ تڑپاؤ۔"

"محبت اور وہ بھی مجھ سے — تم اور محبت......؟

واہ کیا بات کہی ہے! میں کہتی ہوں اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں تمہاری یا اور کسی کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تم سب خونی بھیڑیے ہو! وحشی درندے ہو!! تم محبت کے نام پہ کلنک ہو — سنا نہیں! میں کہتی ہوں چلے جاؤ یہیں.... جہاں سے تم آئے ہو!"

"اور تم زیبو —؟"

"میں پوچھتی ہوں۔ میری خوشامد کرنے کی تمہیں کب سے سوجھی ہے۔ میں جہاں ہوں۔ جس حال میں ہوں تمہیں اس سے کیا سروکار..... اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں بپھر گئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے"!

"زیبو! میں تنہا واپس کیسے چلا جاؤں جبکہ تم سے میری زندگی کی دھڑکنیں وابستہ ہیں"!

"جھوٹ۔ لغو۔ بے بنیاد! تم چاہتے ہو کہ میں پھر سے اسی بستی کو اپنا لوں جہاں عصمت، آبرو اور شرم و حیا کے پیرہن دولت کی چمک دمک کے عوض تار تار کر دیے جاتے ہیں۔ کیا میں پھر سے اس دنیا میں آ جاؤں۔

"سنو! شہری بابو۔ یہ دنیا انسانوں کی بستی نہیں حیوانوں کا مسکن ہے۔ انسان کب کا مر چکا ہے۔ تم..... تم واپس چلے جاؤ! میری نظروں

سے دُور ہو جاؤ۔ تم میرے ارادوں کو کسی طرح متزلزل نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہارے احسانوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لئے خدا کا نام کافی ہے۔ میں حیوان نہیں بنوں گی ـــــ وحشی نہیں بنوں گی۔"

زیبو کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ ماتھے پر نم و غصہ کے آثار جھلکنے لگے۔

اُس کا سارا جسم دیکھتے دیکھتے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ایک نامعلوم خوف یا دل شکن یاد کے باعث اس کے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ وہ اور اُس کی جوانمندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی۔

شیرو نے زیبو کو سہارا دیا۔

"زیبو! یہ کیا ہوا۔ کچھ مُنہ سے تو کہو زیبو۔ میرے لئے تمہاری خاموشی موت ہے۔"

شیرو نے اُس کا نازک بدن پکڑ کر اُسے جھنجھوڑا اور پھر اُس کے سر کو زانو پر رکھ کر وہ عالمِ پریشانی میں غرق تکتا رہا۔ زیبو پر بد حواسی مکمل طور سے چھا چکی تھی۔ شیرو متحیر لگا ہوں سے اُس پیکرِ حسن کو دیکھتا رہا کتنی امنگیں اس کے دل میں اٹھیں اور بیٹھ گئیں۔ کتنے ارمان جاگے اور سو گئے۔ وہ زیبو کی حالت کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ اس حالت میں زیبو اور بھی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا سارا حسن کتنا دل کش اور دل نواز تھا۔

شیر دل نے آج پہلی بار اُس کے جسم سے ہاتھ مس کرے۔

آج شیر دل کی محبوبہ اس دنیا اور اس کی زندگی اس کے سامنے بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ایک دل آویز و دل کش مورتی اس کے سامنے تھی جسے حاصل کرنے کے لئے شیر دل نے نہ جانے کتنی مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا۔

شیر دل کے دل میں کتنی آرزوئیں تھیں کہ زیبو ایک لمحہ کے لئے ہی اُس کے بازوؤں کے حلقے میں آجائے یا اس کی گود میں اپنا سر رکھ دے۔

آج زیبو کا نازک جسم اس کے قبضہ و اختیار میں تھا لیکن وہ حرف حسرت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ سرتاپا۔ استعجاب میں غرق تکتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ زیبو کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ چند منٹوں کے بعد زیبو نے ہوش سنبھالا۔ بڑی بڑی پلکوں کو اوپر نیچے کئے وہ خائف زدہ عقاب کی طرح شیر دل کی گود سے الگ ہو گئی۔

"تم ابھی تک یہیں ہو شہری بابو ..... میں نے ٹھیک کہا تھا اور پھر کہتی ہوں کہ میرا پیچھا کرنے سے تمہیں نقصان پہنچے گا ــــ اوہ! تم رو بھی رہے ہو ــــ لیکن کیوں؟"

"کیا تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔ مجھے چاہتے ہو۔ شہری بابو! کہہ دو یہ سب غلط ہے زیبو! افسوس تم کیوں اتنی دور آئے۔ کیوں اتنی زحمت اٹھائی۔ اب خدا کے لئے لوٹ جاؤ۔ اس بارے میں پیش قدمی سے کام لینا تمہارے لئے سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ شہر میں کتنی ہی لڑکیاں ملیں گی جو مجھ

سے اچھی ہوں گی۔ میں کیا ہوں۔ سچ کہنا شہری بابو! میری کیا حقیقت ہے۔"

"زیبو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہیں اس تکلیف اور اس حالت میں دیکھ کر کیا میں چین سے سو سکوں گا؟ —— زیبو میں تمہارے بغیر جینا یا زندہ رہنا بے معنی سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میری آنکھوں کی روشنی بازوؤں کی سکت اور دل کا قرار تم اور فقط تم ہو۔"

شیرو کی آنکھیں اب آنسو سے بھیگ گئیں۔ دل کا لاوا آنکھوں کی راہ سے پھوٹ پڑا —— اپنا اترا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے شیرو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور زیبو شیرو کی حالت دیکھ کر سکتے میں آگئی۔

آخر اس کے سینے میں بھی ایک عورت کا دل تھا۔ وہ درد سے بھر گیا۔ اور حال دل رو رو کر بیان کرنے لگی۔

"بابو! مرد ہو کر روتے ہو —— بابو! کیا تم کسی بھی طرح مجھ سے کنارا کشی نہیں کر سکتے —— تم مانتے کیوں نہیں کہ میں اب تمہارے یا اور کسی کے لائق نہیں رہی ہوں۔ میں تمہارے قابل نہیں بھول بابو!"

"یقین کرو اُس زیبو اور اِس زیبو میں بہت فرق ہے۔ میں اب وہ زیبو نہیں رہی ہوں جس کی تمہیں جستجو ہے۔ چاہ ہے۔ بابو وہ زیبو مر چکی ہے۔ اب اُس زیبو کو کوئی نہیں پا سکتا۔ تم بھی نہیں —— تمہیں جس زیبو کی چاہ ہے اور تلاش ہے وہ ابدی نیند سو گئی ہے۔ اب مجھے بھول جاؤ۔"

"آخر وہ کیا بات ہے۔ جس کی وجہ سے میں تمہیں اپنا کر خوش نہیں

رکھ سکتا؟ زیبو تم اب بھی میری ہو۔ میری۔ کاش تم میرے دل میں جھانک کر دیکھ سکتیں ـــــ میں تم سے صرف یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم مجھے چاہتی ہو یا نہیں؟"

"بتاؤ۔ بتاؤ زیبو۔ خاموش کیوں کھڑی ہو۔ میں اپنے سوال کا جواب اسی وقت چاہتا ہوں۔ زیبو تمہیں میری قسم!"

"تمہاری قسم! لیکن بابو کیا کرو گے سن کر۔ کیا میری کہانی سننے کی اپنے میں طاقت رکھتے ہو؟ جس میں فقط سسکیاں، آہیں اور نالے ہیں بس اتنا جان لو کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں!"

"زیبو! کیا میری یہ حالت دیکھ کر بھی تمہیں میری محبت پر یقین نہیں آتا؟ "میری باتوں پر تمہیں اعتماد نہیں؟ زیبو کچھ تو بولو کچھ تو بتاؤ۔ آخر اس میں کیا رازِ پنہاں ہے کہ تم اپنے کو بربادی کے غار میں دھکیل دینے پر آمادہ نظر آتی ہو۔ میں تمہیں اس ہستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ جو تمہیں اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کچھ منہ سے تو کہو!"

"بابو بس کرو۔ آگے کچھ نہ کہو۔ میں اور کچھ سننا نہیں چاہتی۔ بہتر یہی ہے کہ میری یاد کو دل سے باہر نکال کر چلے جاؤ ـــ بابو! مجھے تمہاری محبت کا پاس ہے۔ تمہاری ہمدردی کا لحاظ ہے اور اسی لئے کہتی ہوں کہ مجھ سے رابطہ نہ بڑھاؤ۔"

"یقین کرو میں تمہیں خوش اور شادماں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس لئے میری چاہ چھوڑ دو۔ مجھے پریشان کرنے سے تمہیں کیا ملے گا۔"

دونوں طرف خاموشی چھاگئی۔ متانت آمیز خاموشی۔ اور مکمل سکوت۔ ایک دوسرے پر نگاہیں مرکوز کرنے کے بجائے دونوں پاس ہی بنفشہ کے جھنڈ کو دیکھنے لگے۔ بنفشہ کے پھولوں کی لچک اس ہلکی تاریکی میں قابل دید اور دل آویز معلوم ہوتی تھی، شیرو نے بنفشہ کی ڈالی کی طرف ہاتھ بڑھایا معاً جھاڑیوں کی اوٹ میں سے رونے کی آواز آنے لگی اور خاموش فضا میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ شیرو کی حالت غیر ہوئی، وہ حیران و ششدر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

زیبو سہمی جھاڑیوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر کرتی سرعت کے ساتھ تھوڑے فاصلہ پر چنار کی جانب بڑھی اور ایک معصوم بچے کو گود میں لئے شیرو کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

"یہ دیکھو بالو! ہاں اسے غور سے دیکھو۔ کیا اس ننھی سی جان کو دیکھنے پر بھی میری تمنا کرو گے۔ بتاؤ! بولتے کیوں نہیں۔ تمہاری زبان پر تالے کیوں پڑ گئے؟"

"زیبو! یہ تم نے کیا کر دیا؟ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں......"

"کیوں! جوش و خروش مدھم پڑ گیا؟ محبت کا بھوت سر سے اتر گیا؟ جو تم محبت کا دم بھرتے تھے۔ جب مجھے اپنانے کی ٹھانی تھی۔ اب وہ ولولہ کہاں گیا — میں تمہاری زندگی تھی — اب وہ جذبہ کیا ہوا"۔

"بالو پسینے سے بھیگ کیوں گئے؟ میں جانتی تھی کہ حقیقت ظاہر ہونے کے بعد تمہارا سب جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اور میرے لئے تمہارے

دل میں نفرت جاگ اُٹھے گی۔ — آخر تم بھی تو شہری بابو ہو! ٹھیک اس مُنّے کے باپ کی طرح —

— بالکل اُسی کی طرح ہو جس نے مجھے اپنے دام فریب میں پھانس کر کہیں کا نہ رکھا۔ اُس نے جس طرح مجھے برباد کیا۔ میں بیان نہیں کر سکتی وہ کرایہ دار کی حیثیت سے ہمارے گھر میں آبسا تھا اور میں اُس کے لئے بیٹی کے برابر تھی۔ لیکن اُس گِرے ہوئے بد طینت انسان نے میری سادہ لوحی کا اس طرح سے ناجائز فائدہ اُٹھایا کہ بیان سے باہر ہے۔ پہلے چرب زبانی اور میٹھی باتوں سے اُس مُعمر نے مجھے رام کرنا چاہا۔ لیکن میں اس کی طرف ذرہ بھر نہ جھکی نہ متوجہ ہوئی۔ پھر بھی وہ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے مجھ پر ڈورے ڈالتا رہا۔ اور پھر اُس نے مجھے والہانہ طور سے چاہا۔ محبت کا دم بھرا جس طرح تم نے چاہا اور چاہنے لگے تھے ....

ایک رات میں نے اپنا سب کچھ لُٹا دیا — میں بے بس تھی۔ میں کچھ نہ کر سکی۔ اُس نے مجھ سے وہ گوہر گراں مایہ چھین لیا جس کی حفاظت دل و جان سے کرتی آئی تھی .... اور چھ مہینے کے بعد مجھے سدا کے لئے اپنا بنانے کا فریب دے کر وہ اس بستی سے ایسا چلا گیا کہ اب تک واپس آنے کا نام نہ لیا .... اور کچھ دنوں کے بعد میں "ماں" بن گئی۔ پھر بھی اُس نے اپنی شکل نہ دکھائی۔ اب اُس کی یہ نشانی لئے میں اس بیابان میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ صرف اس ننھی سی جان کے لئے۔

اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے۔
سماج سے دُور۔ بستی سے الگ۔۔۔ اور اپنوں سے جُدا!
میں اس قابل نہیں کر سکتی۔ لوگوں کے سامنے سر اونچا کر سکوں....
میں اب وہ زیبو۔ نہیں رہی۔۔۔ بالو تم چلے جاؤ مجھے ستانے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ جبکہ میری حالت زندہ لاش کی سی ہے.....
...... اور ہاں بالو! اس لیٹر...... خونی بھیڑیے کی میرے پاس ایک اور چیز بھی ہے۔ دیکھتے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کبھی وہ شہر میں تمہیں مل جائے۔ وہ بھی تو شہر ہی کا تھا۔ اُس سے اگر ملاقات ہو تو یہ اُسے واپس کر دینا۔ میں اب اسے اپنے پاس رکھنا پاپ سمجھتی ہوں گناہ سمجھتی ہوں!"
یہ کہہ کر زیبو نے کمرے سے نکلی ایک میلی سی تھیلی داہنے ہاتھ سے آگے کر دی۔ گرہ کھول کر ایک، فوٹو اس تھیلی میں سے نکال لی۔ اور شیرو کے ہاتھ میں دے دی۔
"یہ ہے اس بچے کا باپ........ یہ تصویر اسی کی ہے۔
"زیبو........ یہ......... یہ......... یہ
.... یہ...... میں...... کیا...... دیکھ......
رہا"...... میرا..... با۔۔۔ با۔۔۔ با۔۔۔"
اپنی ہی تصویر دیکھ کر شیرو کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔

اب آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ کر اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔

زیبو نے بچے کو چھوڑ کر شیرو کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن بے سُود وہ اب بے جان پڑا تھا۔ اس کی روح نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

ایسٹرن کالب

فضا خاموش تھی۔

تاریک رات کے سیاہ فام سائے پھیل رہے تھے!! دسمبر کی آخری رات تھی۔

لیکن ایسٹرن کلب کے سامنے سکون و تاریکی اور سردی کو کوئی وقعت نہ تھی! اس کی بسیط گود میں شور و غل و ضیا پاشی اور حرارت کی شمعیں اب بھی آب و تاب سے روشن تھیں ...... اور روشنی پھیلانے میں پیش پیش تھیں!!

آس پاس کی ساری دنیا سونے پر ایسٹرن کلب کی دنیا جاگتی ہے.

بادل چھٹ گئے!

اندھیرا غائب ہوگیا۔

اور آن کی آن میں ہر سو چاندنی کے سائے منڈلانے لگے۔

کلب ہال کے وسطی گوشے کے ڈائیس پر پیانو، بربط، نقارہ اور دیگر جدید طرف کے اسباب موسیقی لئے سازندے سریلے اور دھیمے دھیمے راگ الاپ رہے تھے! دیکھتے دیکھتے میٹھے سُروں کی مستی و دل آویزی کلب ہال کی وسعتوں میں بکھر گئی!...... اور آشالتا تمام رعنائیوں سے مزین رونق افروز ہوئی! اُس کی نیم عریاں بھری باہوں اور پریشان زلفوں کے مقابل شاخ سنبل اور برسات کی کالی رات، ہیچ تھی!

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ ہر ایک کی نظروں کا مرکز شہہ نشین بنا تھا جہاں آشالتا کی انگلیاں پیانو پر ناچ رہی تھیں!!

آشا جوان تھی۔ اُس کی جوانی کی طرح اُس کا رقص بھی جوان تھا! اُس کی ہر تھرکن ہال کے ہر ذرے پر رعنائی و دلکشی کے نقوش بکھیر رہی تھی!

سربمہر بوتلوں کے کاگ اڑ رہے تھے! گلاس اور جام ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ مرغ مسلم کی قاشیں بانٹی جا رہی تھیں اور گوشہ راستہ میں باؤن پتوں کی اٹھک بیٹھک ہو رہی تھی!

—— موہن حسب عادت ہال کے درمیانی گوشے میں تسلط جما گیا.... پنیر پکوڑا منہ میں ڈالے اور کافی کی بھرپور چسکی لئے وہ آشالتا کے اٹھتے بیٹھتے سینے اور کتابی چہرے کے زیر و بم کا جائزہ لینے لگا اور پھر ایک گھناؤنی نظر کلب کے مکینوں کی طرف ڈال دی.... اس سرے سے اُس سرے

تک، ناکا — عجب سے لگا اس سے ..... ہر طرف خوشی ..... مسرت ..... شادمانی ۔ جام ٹکرا رہے تھے اور خالی ہو رہے تھے ۔ موہن نے کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا ۔

رقص ..... نغمہ ..... شراب ..... اور پھر گرنا سنبھلنا ۔

موہن کو محسوس ہوا جیسے یہ ہال شراب کا ایک جام ہے .... لحظہ بہ لحظہ اس جام میں دنیا سما گئی ۔ ساری دنیا .... پوری کائنات ۔

اور ہزاروں کروڑوں انسان کیڑوں مکوڑوں کی طرح اس جام میں تیرتے ڈوبنے لگے ..... باپ کی شفقت ڈوب رہی تھی ۔

بچی کا وچن و پیار غرق ہو رہا تھا ۔

زلفوں کی ہو رنیاں غوطے کھا رہی تھیں ۔

اور وشواس کے تھم خس کی شکل اختیار کئے ادھر ادھر تیر رہے تھے ۔

"موہن ! کہاں کھو گئے ہیں آپ !"

جام نظروں سے اور پھر ہاتھوں سے گر گیا ۔ گر کر چکنا چور ہو گیا ..... اور دنیا سمٹ گئی ۔ اب ہال تھا اور موہن کے مقابل آشا لتا ۔

دتفہ ہو چکا تھا اور گئی چند راتوں کی طرح آج بھی لتا موہن کے پاس آ بیٹھی !

— اصیل نے منجری کر لی تھی ۔ اور آشا لتا موہن کی بابت اتنا جانکاری حاصل کر گئی تھی کہ وہ شہر کا بلند پایہ کہانی کار ہیں ..... اُسے اگر نفرت ہے تو دو چیزوں سے سگریٹ اور شراب اور رغبت کافی کے

ساتھ ..... اتنا بھی جان چکی تھی کہ موہن جبلی حسن پرست ہے۔
حسن اور خوبصورتی کو پوجنا اُس نے اپنا شعار بنا لیا ہے
..... یہ خوبصورتی اور حسن چاہے اُسے انسان میں ملے یا حیوان
میں ..... نخلستان میں ملے یا اجنتا کے پتھروں میں ..... پھولوں میں
دستیاب ہو یا کانٹوں میں۔

"موہن تم سوچ کیا رہے ہو"
آشا ایک بار پھر قفل سکوت توڑتے پھیلتے پھیلتے آپ کی جگہ تم اپنا
گئی!

"سوچ رہا ہوں یہ دنیا دوسروں کے لئے کتنی دلکش اور حسین ہے،
اور اپنے لئے کس قدر پھیکی اور بے جان"

"موہن تم خوبصورت تصورات اپنائے پرکھنے کی سعی اپناؤ .....
دُنیا تو دُنیا تمہیں اس جگہ بھی دلکشی اور خوبصورتی نظر آئے گی .....
سب کچھ حسین لگے گا ..... میری جانب دیکھو"

"تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں حسین سمجھوں" موہن بے تالی کہہ اُٹھا۔
"کیا میں حسین نہیں" آشا کا لہجہ استفساریہ پیدا کئے گویا ہوئی
اور بیئر کا آدھا بھرا گلاس اُس کے ارغوانی ہونٹوں کے ساتھ چسپاں
ہوا!

"تم ..... تم تو مصنوعیت کی مورتی ہو۔ تصنع کے سنگ رُخ پر بغاوتی
حربوں کے استعمال سے تشکیل دی گئی ..... تم اور تمہارے حسن میں

حقیقت اور اصلیت کو دخل نہیں"۔

موہن برس پڑا۔

"موہن تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ہزار ہا روشن قمقموں کی چمک کو تیاگ دے۔ تمہارے چھوٹے سے دیئے کی لو کے قریب آ بیٹھی ہوں۔ اس لئے کہ مجھے تمہارے پاس بیٹھنا اور تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے میں موہن ۔۔۔ تمہیں چاہتی ہوں"۔

ایک مفلس کہانی کار کو دل دینے سے تمہیں کیا ملے گا"۔ موہن کا احساس برتری جاگ گیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ دولت و حشمت کے طلباق پر فخر کرنے والی عورت کا دل کسی ایک کا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں دولت کی ضرورت اور چاہ ہے۔ اور ہر چیز کو دولت و شہرت کے پیمانے سے ناپنے کی سوچتی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہو گا ۔۔۔۔ ایسا میں کبھی نہیں ہونے دوں گا"۔

نہیں موہن! نہیں تم نے مجھے غلط جان لیا ہے"۔ آشا کی آواز میں عجز و انکساری تھی!

"کیا اس میں صداقت نہیں کہ تمہیں ایک خوبصورت موٹر کار کی ضرورت ہے! عالیشان بنگلہ کی آرزو ہے اور پھر آسائش و آرام کی چاہ ہے۔ ۔۔۔۔ یہ سب میرے پاس نہیں ہے ۔۔۔۔ تمہارے لئے سب کچھ پیسہ ہے اور تمہیں دنیا کی ہر چیز اس پیسے کی طرح گول دکھائی دیتی ہے۔ موہن یہ سب کچھ جانتا ہے"!

"نر سے بار ہو ہو"

آشالتا موہن کو خطاب بخشتے ہوئے ڈائس پر براجمان ہو گئیں اور پھر سے کلب ہال میں نیلی چمکیلی ساڑھیاں۔ رقص کرنے لگیں!

—— آشالتا کا رقص اور نغمہ ہائے دل نواز کلب ہال کی مضبوط دیواروں سے پھاند کے باہر نکل آیا۔ اور آس پاس کے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔۔ ایک مختصر قیام میں آشالتا نے ہر معزز گھرانے کے نور چشم کو اپنی جانب متوجہ کر دیا۔۔۔ کلب ہال معمول سے بڑھ کر کھچا کھچ بھرنے لگا۔۔۔۔ اور پھر ہر ایک کی نگاہیں آشالتا کے جسم کے نشیب و فراز پر جم کر رہتی تھیں۔۔۔۔ دیکھتے تھے۔۔۔۔ سوچتے تھے اور پھر اٹھتے چلتے تھے۔۔۔۔ ایک مطربہ ہال میں بیٹھے تمام حضرات کی توجہ کا مرکز بنی تھی مگر ان سب سے بے نیاز۔ لاجز خود مطربہ کی توجہ کا مرکز موہن تھا جس سے لوگ حقارت بھری نظروں سے تاکا کرتے تھے۔ بعض تو اتنا بھی کہہ گئے تھے۔

"اس قلاش راہ پھرے کا کلب میں کیا کام"۔

—— اگلے روز موہن وقت سے پہلے ہال کی زینت کافی کی گرم گرم بھاپ سے بڑھا گیا۔ اور آشالتا سب مصروفیات کا پلندہ وہ اچھے پر رکھے سجی دھجی موہن کے روبرو آ بیٹھی —— کافی کا گرم گرم ایک اور کپ تیار کر کے اس نے موہن کی جانب بڑھا دیا۔

"لیجئے۔ کہانی کار صاحب۔ نوش فرمائیے"۔ آشالتا کے لہجے میں طنز تھ

اس بار پڑا دخل تھا۔

"شکریہ! تم نے زحمت کیوں اٹھائی"۔ موہن نے کڑی نگاہوں کی مدد سے آشا لتا کو جھانکنا شروع کیا۔ جو نیم عریاں پوشش میں ملبوس ایک قیامت سے کم نہ لگ رہی تھی!

"آج کل کون سی کہانی لکھی جا رہی ہے"۔ لتا نے موضوع سخن بدلنے کی غرض سے کہا۔

"کہانی! کچھ بھی نہیں ..... فی الحال خود اپنی ہستی ایک کہانی لگ رہی ہے"۔ موہن نے بات کو ٹالنا چاہا۔

"موہن: تمہیں کیا ہوا ہے۔ جب دیکھو بہکی بہکی سنائے جاتے ہو۔ اس ایک ہال سے وابستہ تمہیں سینکڑوں کہانیاں مل سکتی ہیں ..... خود بے اعتمادی کی مشعل روشن کیے لکھو ان شرفا کی کہانی ..... جو ماحول۔ معاشرہ اور سماج کی چار دیواری کو پھاند کے یہاں سب کچھ حتیٰ کہ اپنی عزت و آبرو لٹانے بھی آ جاتے ہیں ...... وہ یہاں آ کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنا وقار اپنی عظمت اور اپنا مرتبہ سب کچھ فراموش کر جاتے ہیں ... موہن دیکھو .... میری طرف ...... ان آنکھوں میں ـــ ان میں جھانکنے اور گدازیوں میں کھو جانے سے تمہیں بے شمار کہانیاں ہاتھ آئیں گی! ... میری کہانی لکھو!

"تمہاری کہانی اور اس کلب ہال کی کہانی ـــ تم چاہتی ہو کہ میں زوال پذیر داستان کو الفاظ کی لڑی میں پرو کر صفحہ قرطاس پر بکھیرے اپنے فن کے

ساتھ ظاہر کروں اور کہانی کی بناوٹی قصہ کی صورت میں پیش کروں۔ یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ ملمع آرائی کی ہیچ اپنانے میں حقیقت کا بیچ کنی کرنے سے رہ گیا" موہن بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"موہن تم جانتے کیا ہو ..... کیا یہ درست نہیں کہ میں حسین اور دلکش ہوں" لتا کے ماتھے پر ترشی و تلخی کے آثار پیدا ہوئے!

"وہ تو سب کچھ ہوا" موہن مستعدی پن اپنا گیا ... مگر آشا لتا میں پیش منظر سے زیادہ پس منظر کا دلدادہ ہوں اور ظاہری لوازمہ و ملکیت قطع نظر رخ کو پانے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ یاد کر دیا نہیں .... میں دیکھ رہا ہوں کہ ان خوبصورت آنکھوں کے عقب میں ڈھیلے کنڈے اور حلقے پڑے ہیں۔ ان رنگیلے چمکیلے لبوں کے پیچھے لامتوازن دائرے ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں اور ان حسین دابھرے رخساروں کی جگہ پچکے سمٹے گالوں نے لی ہے .... تم لتا پس منظر کا نظارہ کرنے سے رہ گئیں! جبکہ ظاہری رنگ و روپ کو جاننے سمجھنے سے ہی تمہیں فرصت نہیں ملتی! نہ ہی تم نے کبھی ......

"تم حد سے متجاوز کر رہے ہو" آشا لتا نے بات کاٹ لی!... تم نادان ہو جو دنیا کو نیچا دکھانے کی فکر میں خود رنگ دنیا کے بحر بیکراں میں جا گرتے ہو۔

اس سے قبل کہ موہن جواب میں لب ہلا دیتا کلب کے مالک مرلگھوان داس اچھی قد و قامت رکھنے والے نوجوان کے ہمراہ نمودار ہوئے!

"یہ رہی اس کلب کی مشہور ڈانسر و سنگر آشا لتا۔ اور یہ ہیں میرے بڑے بیٹے سرجیت کمار... آج ہی باہر سے اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" یہ سرجیت تھا۔

"خوب! یہ ہیں جناب کے فرزندِ ارجمند.... ویل.... ویل.... گڈ۔"

آشا لتا، بھگوان سے کہہ گئی اور انداز گر کے ساتھ سرجیت کمار کو گھورنے لگی، جیسے ایک اناڑی جیب کترہ پکڑے جانے پر سپاہی کے کمر بند سے لگی ہتھکڑی تک اور گھورتا ہے۔ معاً لتا سامنے سے غائب ہو گئی اور ذرا توقف کے بعد انگلیاں پیانو پر تھرکنے لگیں!

—— اب تو وقفہ ہونے پر بھی موہن اکیلا رہا کرتا تھا... آشا لتا موہن چھوڑ سرجیت کے پاس بیٹھنے لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے اور بے تکلفی جتانے لگے۔ دونوں جوان ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں کی امنگیں جوان تھیں اور پھر پینے پلانے کا شوق مشترکہ تھا۔ اس خاطر سریع المیعادی میں ہی وہ دونوں اس قدر گھل مل گئے جیسے دیرینہ جان پہچان ہو اور باہمی تعلقات گہرے اور شستہ ہوں..... یہ عمر..... جوانی کا زمانہ..... اس میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

—— ایک شام وقفہ کی پہلی گھنٹی بجتے ہی لتا ہشاش بشاش موہن

کی بغل والی کرسی میں بیٹھ گئی! ـــ موہن کی نظریں جو کھا جانے والی پر جمی تھیں ۔ اُٹھ پڑیں ۔ اور لتا کے اُتار چڑھاؤ کا تجزیہ لینے لگیں!

"خوشی سے پھولے نہیں سماتی ہو! آج کوئی خاص بات ہے" ۔ موہن نے پہل کی!

بات ہی کچھ ایسی ہے .... موہن! اب زندگی مجھے حسین جان پڑتی ہے"

"حسین اور زندگی!! یہ آسودہ حال کلب اور زندگی حسین نہ لگے .... اور پھر تمہارے لئے زندگی بے کیف کب تھی؟"

"موہن! تمہیں کسی ایک کی دل شکنی کا ذرہ بھر لحاظ نہیں رہتا" .... لتا کی آواز میں غیض اور عتاب کی مخلوط حرارت صاف عیاں تھی!

میں حق پر مبنی بات کو طشت از بام کر دینا اپنا فرض مقدم جان گیا ہوں" .... موہن پُر شتاب لہجے میں کہہ اٹھا ۔ "آشا لتا! میں منہ پھٹ ضرور ہوں مگر جو کچھ کہوں گا صحیح اور درست کہوں گا .... اگر واقعی زندگی کی قدر و قیمت کو جاننے سمجھنے کا اشتیاق تمہارے دل میں پیدا ہوا ہے تو پھر کلب ہال سے باہر نکل جایئے! اور زندگی کا اصلی و حقیقی روپ دیکھئے! اس گندے جال میں پھنسے زندگی کو حسین جتانا زندگی کی توہین کرنے کے مترادف ہوا .... اس وقت تم نہیں بلکہ اس کلب کی خوش گپ و کیف و سرور سے مخمور تھا بول رہی ہے اس کلب کی بے دقعت رنگ رلیوں

کو اپنی کائنات تصور کر کے اپنی زندگی پر ظلم نہ کرو...... لتا! یہ قہقہے وقتی ہیں...... انہیں گُم ہونا ہے...... اس کلب سے وابستہ ہر شئے میں بے ثباتی مضمر ہے ___ یہاں کسی چیز کو پائیداری حاصل نہیں.. .... بقا کا ساتھ نہیں......

موہن خود بخود خاموش رہا۔ اُس کی نظریں پھر سے اوپر کو اٹھیں..... آشالتا شہ نشین کی طرف بڑھ رہی تھی اور اپنے آنچل سے دیدوں کے تر حلقے خشک کر رہی تھی۔

آشالتا کی مخمور جوانی، مست کر دینے والے رقص اور دل پذیر نغموں نے اہل دل کے سامنے اس کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ اور ہر ایک اسے اپنے خوابوں کی ملکہ خیال کرنے لگا ___ بیشتر شریف زادے اس کی بدمست جوانی کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھرا کرتے تھے.... نواب اصبا بھی اُس کی شان میں قصیدے سنا گئے تھے اور تو اور خود کلب کے مالک ہر بھگوان داس کے منہ میں بھی لتا کی دوشیزگی دیکھ کے پانی بھر آیا تھا ...... اور وہ چاہتا تھا ایک گھڑی ہی سہی وہ لتا کو آغوشِ محبت میں گذار دے!..... وقت گذر گیا اور چاہ بڑھتی گئی!

بالآخر اس چاہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اس نے اٹھا لیا..... سب سے پہلے اپنے لاغر جسم میں پھیلی نسوں اور اعصاب میں تازہ روح پھونک دینے کے لئے اس نے بوتل کا کاک اُڑا دیا..... پیگ پر پیگ چڑھائے ہر بھگوان داس بھول گیا کہ وہ اس کلب کا

مالک ہے۔ ایک ممتاز شخصیت کے ناطے دنیا اُسے یاد کرتی ہے، اور جانتی ہے..... وہ اتنا بھی فراموش کر گیا کہ اس کی اپنی بیٹی لتا سے دو سال بڑی ہے..... گرتے سنبھلتے اور لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے بڑی رات گئے۔ لتا کے کمرہ شب باشی کا رُخ کیا ـــــ جب کہ خود کلب کی دنیا بھی تھکی سی بے سکت پڑی تھی! دروازے پر دستک دی اور آشا لتا نے اس خیال سے کہ ماما ہو گی چٹخنی گرا دی۔

"آپ"

"ہاں لتا میں ہوں..... ہر بھگوان داس.... اس کلب کا مالک..... آخر تمہارے حسن کی کشش مجھے یہاں لے لائی..... تم کتنی دلکش ہو۔ لتا میں تمہیں اور تمہارے رقص کو ایسے میں دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ خلوت اور تنہائی میں بیٹھ کر جہاں تم ہو اور میں۔ اور کوئی نہیں۔ میں تمہارے نغموں کو صرف اپنے لئے لمفوف پردوں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں..... میں نے کب سے چاہا کہ تمہیں اپنے حال سے باخبر کر دوں..... لتا تم بھاگتی کیوں ہو۔ پاس آؤ..... دیکھو یہ دل لگی اچھی نہیں ہے..... یہ مذاق....."

ہر بھگوان کی زبان کام کر رہی تھی اور لتا حیران و ششدر کھڑی مجسمہ حیرت بنی تھی۔ وہ کچھ ترکیب عمل میں لانے ہی والی تھی کہ ہر بھگوان داس نے بڑے بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ کمرہ روشن ہوا۔ تپائی پر سجے ٹیبل لیمپ کی رنگین و مدھم کرنیں اس روشنی میں مدغم ہوئیں اور ہر بھگوان

داس کی بے سُدھ نگاہیں کمرے کا طواف کرنے لگیں۔ اینجا آنجا دیکھنے گھومنے پر اُس کی بے ترتیب نظریں بغل میں پڑے پلنگ پر جم کر رہ گئیں ..... اُس کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ہوش و حواس کی متوازن جھیل میں تلاطم بپا ہوا اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی .... اُس نے پھر جھانکا پلنگ پر مست خرام اُس کا سرجیت پڑا تھا ــــ ہر بھگوان کے قدم لڑکھڑا گئے ...... سر چکرا گیا .... اور کچھ کہے بنا واپس چلا آیا ....

.... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن زبان گنگ پڑی ...... اُس کے احساسات کے تختے پر جیسے کسی نے کوفت و کرب کے تیروں کی چاندماری کر دی ہو ــــ اس کا جنون اور نشہ کافور ہوا!

صبح صادق یہ خبر شہر کے ہر چھوٹے بڑے چوراہے پر بحث و تمحیص کا موضوع بن چکی تھی کہ مس آشا لتا اور سرجیت کمار فرار ہو گئے ہیں۔

قیاس آرائیاں ہوتی رہیں، چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں اپنائی گئیں لیکن اس کے باوجود بھی سب لوگوں کے لئے ان دونوں کا اچانک غائب ہونا ایک معمہ بنا رہا .... اور اس معمہ کا عقدہ اُس گھڑی وا ہوا جب کہ موہن کو دوسرے شہر سے غیر متوقع طور پر آشا لتا کا نامہ موصول ہوا ..... نفس مضمون مراسلہ کا کچھ اس طرح کا تھا۔

موہن جی!

نمستے

میں آپ کی لتا ہوں، یاد ہے ...... ایک بار نہیں لیبا اوقات

مطلب ہال میں آپ نے مجھے کسی طرح سے ٹوکا تھا۔ اور مطلع کیا تھا کہ میں گندے جال میں مقید پڑی ہوں ..... سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں ...... کہا تھا کہ میں معنویت کے کھڈ میں پڑی ہوں جہاں حقیقت کا نام و نشان ملنا غیر ممکن ٹھہرا .....

اب میں اس جال اور اس کھڈ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سے الگ کر بیٹھی ہوں۔ اتنی دور آنکلی ہوں کہ اس جال یا کھڈ کی پرچھائیں بھی میرا تعاقب نہ کر سکے گی! یقین کیجئے میں اس گندگی اور پراز بناوٹ نگری سے سدا کے لئے ناتا توڑ چکی ہوں ...... اور ایک ایسی دنیا میں آئی ہوں جہاں زندگی اور اپنی کائنات کو اصلی اور ازلی روپ میں دیکھ رہی ہوں ...... اپنے پتی سرجیت کے ساتھ میری ہنسی خوشی کٹ رہی ہے۔

التجا کرتی ہوں۔ اب جبکہ گندے جال سے وابستگی نہیں رہی کم از کم میری کہانی شروع کر دیجئے! اب تو آپ کو اعتراض بھی نہیں ہو چاہیئے! زندگی نے ساتھ دیا تو پھر یاد کروں گی!

آپ کی
آشا لتا

موہن خط کو ایک بار چھوڑ کئی بار پڑھ گیا ..... انگشت شہادت دانتوں میں دبائے سوچنے لگا۔

لتا کو سرجیت مل گیا ..... سرجیت کو منزل حاصل ہوئی ......

..... اور میں انتہا بر گشتہ بخت ٹھہر اکر منزل کو اپنے قریں پانے پر بھی حاصل نہ کر سکا .....“ دیکھتے دیکھتے ہزار دل لتائیں موہن کے رُو برو منڈلانے لگیں ..... رقص کرنے لگیں .... اس کی کائنات وجد میں آ گئی۔

اوہ غیر ارادی طور پر چلّا اٹھا۔

کاش مجھے بھی ایک لتا مل جائے —— جسے خوبصورت موٹر کار کی ضرورت نہ ہو .... عالیشان بنگلہ کی ضرورت نہ ہو —

کاش مل جاتی۔ اور میرے غرلیق ظلمت ماحول میں اُجالا بھر دیتی —“

▼ ▼

پھول کا ماتم

محاذ جنگ سے واپس آنے پر نملا کا دل کام میں نہ لگا۔ گو دو چار فلموں کے کنٹریکٹ اس نے لے رکھے تھے۔ لیکن جی اُکتا سا گیا تھا۔ آج بھی حسب معمول اسٹوڈیو جانے کے بجائے بنگلے کے پچھواڑے میں آرام کرسی پر دراز نملا سوچنے لگی ...... نیفا محاذ کے بابت ...... میجر اشوک کی نسبت ہزاروں دلوں کے ساتھ کھیلنے والی دوشیزہ آج مایوسی کے بحر بیکراں میں غرق تھی۔ فلمی دنیا سے وابستہ چنچل اور ہنس مکھ ایکٹرس خلاف معمول بہت مضمحل اور اُداس نظر آ رہی تھی۔ اُسکی غیر متوقع اداسی اور یاسیت کی نسبت جب ایک بار پھر اُسکی ماما پاروتی دیدی نے پوچھ گچھ کی۔ تو نملا جواب میں کچھ کہنے بغیر آہ سرد کھینچے بڑے دالان میں گھس

آئی - اور دور دور تک پھیلے سمندر کو دیکھنے لگی - جس کی کوئی حد نہ تھی ...... بے پایان سلسلہ دار لہریں سمندر کے وشال سینے پر رواں دواں ساحل سے ٹکرا کے گمنامی کے اندھیرے میں کھو رہی تھیں!

دیکھتے ہی دیکھتے بملا کے دل میں ایک ہوک اٹھی اور گئے دو ہفتوں کے نقوش ایک ایک کر کے تحت الشعور میں ابھرنے لگے ـــ جیسے کہ بیتے ایام پلٹ آئے ہوں - اور وہ ایک بار پھر نیفا کے علاقے میں پہونچی - جہاں ہندوستانی فوج کے نوجوان اپنے ملک کے سرحد کی حفاظت جرأت مندی اور بہادری کے ساتھ کر رہے تھے - محاذ جنگ پر تعنات نوجیوں کی دل بہلائی اور دلجوئی کا سامان فراہم کرنے کے لئے دیگر اداکاروں اور گائیکوں کے ساتھ بمبئی جیسے پُر ہنگم ماحول کو چھوڑ بملا کو بھی محاذ جنگ پر آنے کا موقعہ ملا - اس نے جگہ جگہ رنگا رنگ پروگرام پیش کر کے فوجی جوانوں کی دل بستگی و مسرت سے وابستگی ان کا حوصلہ باندھا - نیفا جیسے دور دراز اور الگ تھلگ پہاڑی علاقے میں جا کے بملا کو نہ جانے کیوں خلاف معمول زیادہ خوشی حاصل ہوئی .... نیفا .... بمبئی سے دور یہ الگ تھلگ علاقہ جہاں قدرت کی رعنائیاں چاروں اور جلوہ گر تھیں .... پہاڑوں کے لامتناہی سلسلہ .... آسمان سے باتیں کرتی ان کی چوٹیاں .... تہ در تہ سبز قبا اوڑھے میدان اور شاداب وادیاں جس میں ناگن کی طرح

بل کھاتی چھوٹی چھوٹی ندیاں پتھروں سے ٹکراتی نشیب کی طرف رواں دواں قدرت کی صناع گری دیکھتے بملا من ہی من میں بہت خوش ہوتی۔ اتنا سوچنے کے بعد بملا کو کربناک رات یاد آگئی۔ جب دشمنوں نے جنگ بندی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھاری وزن کے گولے پھینکے تھے۔ حفاظتی چوکی کا بہت سارا حصہ اس گولہ باری کی زد میں آیا۔ وہ بال بال بچ گئی۔

"بملا دیوی فکر نہ کیجئے۔ معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ دو ایک روز میں زخم بھر آئے گا۔"

میجر اشوک گھائل و زیادہ زخمی سپاہیوں سے نمٹ کر بملا کی کلائی پر پٹی باندھتے کہہ گیا تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ! لیکن گھڑی ......"

"وہ تو چوٹ برداشت نہ کر پائی اور آپ کو دغا دے گئی۔ لیجئے میری گھڑی فی الحال کام میں لائیے۔"

اشوک نے کلائی پر چپیاں رسٹ واچ اتار کر بملا کو دے دی۔ جو بغیر کچھ کہے ہراساں اشوک کو دی ہوئی رسٹ واچ کو غور سے دیکھنے لگی۔ اشوک سے وہ پہلے بھی ناچ کے پروگرام میں ایک دوبار ملی تھی اور اس کی شخصیت نے اُسے مرعوب کر رکھا تھا۔ ویسے میجر کوئی خوبصورت نہ تھے۔ لیکن محاذ جنگ پر زخمیوں کی دیکھ بھال اور جوانوں کی گاہ بہ گاہ حوصلہ افزائی کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اسی خصوصیت نے اس کے دل میں اشوک کے لئے جگہ بنالی تھی۔

اور وہ اُسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔

"بملا دیوی ہم دونوں میں فرق ہی کیا ہے ۔ آپ بھی کلاکار ہو اور میں بھی کلاکار ہوں ۔ آپ تو لوگوں کے دل بہلانے کے لئے فلموں میں کام کرتی ہیں اور ہم ملک اور قوم کی سالمیت اور استحکامت برقرار رکھنے کی خاطر فوج میں بھرتی ہو کر نمایاں پارٹ ادا کرتے ہیں ۔ آپ کی اور ہماری کلاکاری میں تاہم کتنا بُعد ہے ...... آپ فلمی دنیا سے وابستہ وطن کے مکینوں کے خوشی اور فرحت کا سامان فراہم کرتی ہیں اور ہم وطن باسیوں کی عزت و آبرو کی سلامتی کے خاطر اپنی جان کو داؤ پر لگانا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں"۔ اگلے روز پٹی بدلتے ہوئے اشوک بملا سے یہ سب کچھ کہہ گیا ...... "نہیں نہیں ..... اشوک صاحب" ...... بملا برجستہ انداز میں بولی ۔ "آپ کی اور میری اداکاری میں بہت فرق ہے ۔ ہم تو زندگی کا ایک ہی رُخ دیکھتے ہیں ...... عیش و عشرت سے لبریز جس میں ہم اور ہماری ہستی کھو کر رہ جاتی ہے ۔ اس کے برعکس آپ لوگ اس زلیت کا کرخت انگیز روپ بھی دیکھ لیتے ہیں ...... سچ ہے کہ ہم دولت حاصل کرنے کی خاطر لوگوں کو وقتی تفریح فراہم کرتے ہیں ۔ لیکن آپ ملک کی عزت اور ملک کے مکینوں کی ناموس کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے"۔ اُدھر محاذ جنگ سے رخصت ہونے پر بملا نے اشوک سے اُس کا ایڈریس لیا اور رسٹ واچ واپس کرتے ہوئے درخواست کی کہ بمبئی آنے پر اُسے ملے ۔ اشوک کچھ دیر سوچ

میں پڑ گئے اور پھر کہنے لگے ۔" نملا دیوی ہماری زندگی ملک اور قوم کی امانت ہوتی ہے ۔ نہیں معلوم مجھے یہاں سے زندہ جانا نصیب بھی ہو گا ۔ اور پھر آپ فلمی دنیا کا درخشندہ ستارہ .... مجھ حقیر کی یاد کیسے آئے گی آپ کو" ......" میجر صاحب ! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ۔" نملا بات کاٹتے بے ساختہ بولی ۔" ہاں ! اپنی دھرتی ماتا سے جسے میں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہوں" ۔ نملا کو میجر کے اس جواب پر اچانک ہنسی آ گئی .... وہ ٹھٹھا کر ہنسنے لگی ۔" اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے نملا دیوی ...... دراصل میں محبت کے بارے میں ترقی پسند ہوں ۔ یقین کرو محبت ایک پاک جذبے کا نام ہے ۔ جو لازوال ہے ۔ محبت کسی فانی چیز سے کرنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے ۔ جس چیز میں ثبات نہیں ...... پائیداری نہیں ۔ اُسے اُلفت جتانے سے کیا حاصل ۔ کبھی کبھی اُسے کھونا ہے ۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر میں نے اپنا سب کچھ اپنے وطن سے وابستہ کر دیا ہے اور وطن کے ہر ذرے سے مجھے اُلفت ہے ۔ یہ دائمی اور پائیدار ہے ۔ یہ محبت میرے مٹنے تک میرا ساتھ دیتی رہے گی" ۔

آج میجر جنگ سے واپس آئے ہوئے دو ہفتے ہو گئے تھے ۔ لیکن نملا شوٹنگ پر نہ جا سکی ۔ دراصل محاذ پر اشوک کی زندگی کی چند جھلکیاں دیکھ کے اس کی دنیا میں انقلاب سا آ گیا تھا ۔ وہ سوچنے

لگی کہ اس کی زندگی کس کام کی ...... آج وہ جوان ہے تو فلمی دنیا میں اس کی قدر ہے۔ کل کو اس کا حُسن جواب دے گا۔ اس کی جوانی بڑھاپے کے دبیز پردے کے پیچھے دم توڑ دے گی۔ اور قدر و قیمت کم ہو جائے گی۔ تو میری حالت پر کٹے پرندے کی سی... ..... اتنا سوچنے وہ ریڈنگ روم میں جاکر اشوک کو خط لکھنے لگی۔ خط میں نبلا نے اشوک کو اس بات کا یقین دلایا۔ کہ وہ اسے پیار کرتی ہے ..... بے نیل و مرام دائمی پیار اور وہ اس کی زندگی میں رچ جانا چاہتی ہے جس میں لقا ہے اور غرض کا دخل نہیں نبلا اس خط کا جواب پانے کے لئے بے تاب تھی۔ روزانہ منشی جی سے خط کے بابت دریافت کرتی۔ اور ایک شام جب اس کی آس ٹوٹ چکی تھی منشی جی نے ایک بیرنگ لفافہ اُسے لاکر دیا۔ یہ اشوک کا تھا۔ نبلا مارے خوشی کے اُچھل پڑی۔ منشی جی نبلا کی اس غیر متوقع تبدیلی پر حیران ہو پڑے لیکن خلاف اُمید خط کی گدازیوں میں جھانکتے نبلا کے بشاشت چہرے پر مردنی سی چھا گئی! اُٹھتے بیٹھتے ہونٹوں پر مُردنی کی تہ جم کر رہ گئی۔ لکھا تھا.......

"مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ اس طرح کا نامہ مجھے آپ کی جانب سے موصول ہوگا۔ آپ کیوں نہیں سمجھتی کہ ہم دونوں کی زندگیوں کے درمیان کتنا بڑا خلا ہے۔ جسے پاٹنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہیں۔ میں ایک ملٹری ڈاکٹر اور میری زندگی ملک کی امانت نہ جانے کب ملک

کی سلامتی کو برقرار رکھنے کی خاطر میری زندگی کام آجائے اور اگر اس محاذِ جنگ سے زندہ واپس آ بھی گیا تو بھی میری دنیا اور آپ کی دنیا میں اتنا فاصلہ ہے کہ ہمارے چاہنے پر بھی یہ فاصلہ کسی طور کم نہ ہو گا۔ میں ایک سپاہی اور اپنے اپاہج پتا کا اکلوتا بیٹا اور آپ ایک ایکٹریس فلمی دنیا کا چمکتا ستارہ...... آپ کا بڑا کام ہے۔ نام ہے اور میں گمنامی کے اندھیروں میں کھویا ہوا ایک سپاہی۔ آپ لاکھوں انسانوں کے دلوں پر راج کرنے والی۔ اور میں زندگی کی تمام تر مایوسیوں کو گلے سے لگائے ہوئے اپنے وجود کو اس دھرتی کا بوجھ خیال کرنے والا...... بملا دیوی ذرا سوچو میری محبت دستِ الفت دراز کرنے سے آپ کو حاصل کیا ہو گا۔ عیش و عشرت کے محلات میں پرورده کلی۔ میری سنسان اور ویران نگری میں قدم رکھنے سے آپ کا دم گھٹ جائے گا۔ ماسوائے کرب اور دُکھ کے کچھ حاصل نہ ہو گا کچھ بھی نہیں...... ایکٹریس کا پیشہ چھوڑ بھی دو تو کیا آپ خوش رہ سکو گی...... کیوں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہو کیوں اپنی قدر و قیمت کھونا چاہتی ہو۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ میری یاد تک کو فراموش کر کے الگ سے اپنی ایک نئی دنیا بسانے میں کامیاب اترو! جس میں خوشی۔ مسرت۔ شادمانی ہر سو رچی ہوئی ہو۔ کاش ایسا ہوتا تو بملا دیوی حقیقتاً مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی" بملا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کی لڑی گرنے لگی۔ اسے خواب میں

بھی اُمید نہ تھی کہ اشوک اس قدر بے رُخی اپنائے گا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور دل چسپی سے بے نیاز سارا سارا دن کمرے میں پڑی اپنی بدنصیبی کا ماتم کرنے لگی .... کیا فلم ایکٹرس ہونا کوئی گناہ ہے کیا فلمی دنیا سے وابستہ ہستیوں کو پیار کرنے کا حق نہیں ....

کیا میرے سینے میں دل نہیں ...... اس میں درد نہیں .... چند دن اسی اضطراب میں کٹ گئے ...... نیلا نے غم غلط کرنے کی خاطر اپنی تمام فلموں کی شوٹنگ میں حصہ لینا بھی شروع کیا۔ لیکن سکون قلب حاصل نہ ہوا اور ڈائریکٹر ورما نے "جیون ساتھی" کے سیٹ پر شکایت بھی کی تھی کہ اس کی اداکاری میں وہ لچک اور توازن نہیں رہا ہے۔ نیلا جواب میں کچھ کہے بغیر گوشۂ تنہائی میں جاکر اپنی بدنصیبی پر رویا کرتی تھی۔ چنچل نیلمی کلی نے اپنے سینے میں چھپے ناسور کو کسی پر ہویدہ نہ کیا' اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے اشوک کے نام پھر سے ایک اور خط ارسال کر دیا اُنسیت اور اپنائیت کے لہجے میں .....

پیارے اشوک ......

"آپ نے محبت کی قوت کو جاننے کی کوشش کبھی نہیں کی ہے۔ جس کا مجھے دُکھ ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آپ پیار کو بھی ایک جنس تصور کرتے ہیں۔ جسے خریدا اور بیچا جاسکتا ہے۔ آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ عورت چاہے کسی روپ میں ہو جب کسی ایک سے پیار جتانی ہے۔ تو اپنا ہر عیش اس پر قربان کرتی ہے .... یہ درست ہے کہ

میں فلمی کہا گہمیوں سے وابستہ ہوں۔ لیکن آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ میرے بھی کچھ احساسات ہیں۔ جذبات ہیں۔ میرا بھی دل ہے۔ جو دھڑکتا ہے۔ ٹھیک دوسری عورتوں کی طرح۔ آپ اس حقیقت کو کیوں نظرانداز کر رہے ہیں! — اشوک اگر آپ کے گھر میں اپاہج پتا ہیں تو میرے گھر میں ایک اندھی ماں اور میرا چھوٹا بھائی بلونت ہے۔ جن کی خاطر میں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ پتاجی کے سورگ سدھارنے پر میرے پاس اس کے سوائے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں آپ سے التماس کرتی ہوں کہ میری محبت کو نہ ٹھکرائیں۔ میں نے آپ کو اپنا جان لیا ہے اور کسی اور کی بابت سوچنا بھی میں اب گناہ خیال کرتی ہوں۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ میں اس فلمی دنیا سے دور بھاگنا چاہتی ہوں۔ بہت دور جہاں ہم دونوں ہوں.....

اور ہماری چھوٹی سی دنیا ہو! محبت اور پیار سے لبریز دنیا جس میں پائیداری ہو۔ برقراری ہو۔ اشوک مجھے اس طرح نہ ٹھکراؤ کہ میں بے موت مر جاؤں۔ میں آپ کی زندگی میں گھس کے آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں۔ آپ کا مساعد بننا چاہتی ہوں۔ یقین کرلو میں اپنے پیشہ اور فن کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں مگر آپ کے بغیر نہیں"۔

اب کے بملا کو یقین تھا کہ اشوک کا دل پسیج جائے گا۔ جواب میں شفقت سے لبریز خط موصول ہوگا۔ لیکن خلاف امید لفافہ چند ہفتے گذرنے کے بعد واپس مل گیا۔ "متعلقہ شخص یونٹ میں موجود نہیں"۔ جملہ پڑھتے ہی بملا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ پاؤں

تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہ اور اس کی ہوش مندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی۔
اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے افعی ناگوں نے جگہ جگہ سے اسے کاٹ کھایا ہو
نہیں ایسا نہیں ہو سکتا .... وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگی ..... ایسا
نہیں ہو سکتا ...... اور پھر تحت الشعور میں خیالات کے دھارے پھوٹ
پڑے۔ ذک و زیاں اور کفاجفا سے لبریز دھارے .... کہیں
اشوک نے ملک کی سالمیت کی خاطر اپنی جان تو نہیں دے دی ہے ....
.... نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ بملا نے سٹیڈیو جانا پھر سے ترک کیے ملٹری
ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے خاطر خواہ
جواب نہ ملا۔ اور ایک شام بملا آرام کرسی پر گم سم پڑی تھی۔ رادھا نے
ایک پیکٹ لا کر دیا جو ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ چاک کرنے پر ایک خط
ملا اور رسٹ واچ۔

"پیاری بیٹی بملا"

"میں نیفا ملٹری ہسپتال کا ڈاکٹر احمد ہوں۔ اشوک کو بچانے کے لیے
یقین کرلو ہم نے بہت کوشش کی۔ لیکن زخم گہرے ہونے کے باعث وہ جانبر نہ
ہو سکے۔ افسوس ہے کہ ہم اس کو بچانے میں کامیاب نہیں اترے۔ میجر اکثر
تمہاری باتیں کیا کرتے تھے ...... کہتے تھے کہ تم اس کی منگیتر ہو اور مرنے
سے قبل اس نے اپنی رسٹ واچ مجھے اس غرض سے دی کہ تمہیں ارسال کر
دوں۔ ساتھ میں اس کے پتاجی کا ایڈریس بھی لکھے دیتا ہوں۔ یہ بھی اس
کی چاہت تھی۔

کملا بیوی تم عمر میں میری بیٹی ساجدہ کے ہمسر ہو۔ اس لئے ایک باپ کی حیثیت سے مجھے اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھو۔ تمہارے منگیتر اشوک نے ملک کی آبرو و سلامتی کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگادی ...... "وہ امر رہے گا"

نہیں نہیں ...... ایسا نہیں ہو سکتا ...... اشوک ......

میرا منگیتر ...... میرا منگیتر ...... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ...... اور اس کی نظر سامنے سے پائی پر پڑی رلیٹ واچ پر پڑی۔ اپنی کلائی پر چسپاں کرکے وہ اس کی سوئیوں کو گھورنے لگی۔ جو مرے مرے انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ اور پھر اس کے دل سے آواز آئی۔

"کملا تم ایکٹریس ہو! فقط ایکٹرس لوگوں کا دل تم بہلا سکتی ہو لیکن اپنا دل نہیں بہلا سکتی۔ تم ایک پھول ہو۔ فقط ایک پھول جس کے رنگ و روپ کے باعث لوگ اُسے چاہتے ہیں۔ طرح طرح سے سجاوٹ۔ بناؤ سنگار کے طور استعمال میں لاتے ہیں۔ لیکن مُرجھا یا کملا جانے پر آخر کے ڈھیر کی نذر کرتے ہیں"۔ آن واحد میں اس کی نظر اشوک کے پتا جی کے ایڈریس پر پڑی اور آنکھوں کے حلقے خشک کئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"منشی جی حیدرآباد کے لئے ہوائی جہاز سے ایک سیٹ بک کرا لیجئے"۔

▼▼

تعارف

بغلة

حسن ساہو میرا دوست ہے، بہت ہی پیارا اور خوبصورت دوست۔ اس قدر خوبصورت جس قدر خوبصورت اس کے افسانے ہیں۔

حسن ساہو ایک اچھا انسان ہے اور ایک اچھا پیارا انسان ہی ایک اچھا فن کار ہو سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ایک سچا سُچا فن کار ہے۔ اس کی تحریریں شوخی بھی ہے اور رنگینی بھی، جدت بھی ہے اور ندرت بھی۔ اس کے افسانوں میں محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور قوس قزحی عشق جھلکتا ہے۔

حسن ساہو کے افسانوں میں کشمیر کی رعنائی بھی ہے۔ اور ڈل کی دلکشی بھی، پھولوں کی رنگت بھی ہے اور کوہساروں کی مست بھری لے بھی۔

حسن ساہو کو سب جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں کہ وہ ایک باشعور مخلص اور پختہ مشق افسانہ نگار ہے۔ اس کے افسانے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

وہ بہت کم لکھتا ہے۔ مگر خوب لکھتا ہے۔ اس کو افسانے کے فن پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اُسے پلاٹ کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہنا پڑتا بلکہ اُس کے گرد و نواح پلاٹ تتلیوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ جب چاہے انہیں اپنی تحریر میں قید کر لیتا ہے۔

وہ بہت ہی حساس دل ہے۔ اُس سے کسی کا دکھ درد نہیں دیکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے افسانوں میں دُکھ کی دُور دُور تک کیوں پرچھائیں نظر نہیں آتی۔

اس کے افسانے سچائی پر مبنی ہیں۔ وہ جھوٹ اور بناوٹ کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ سچ کا پرستار ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے افسانے سچ بولتے ہیں۔

پھول کا ماتم افسانوی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

● موہن یاور